فلسفۂ اقبال

معہ

انتخاب کلام اقبال

از

عبد القوی دریابادی
بی۔ اے

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
حیات اقبال	۳	جواب خضر	۱۱۷	قطعہ (۴)	۱۴۰
تصنیفات	۱۸	طلوع اسلام	۱۱۸	" (۵)	۱۴۰
اقبالیات	۲۲	ضرب کلیم:-		" (۷)	۱۴۱
اقبال کا پس منظر	۲۳	لا الٰہ الا اللہ	۱۲۵	" (۹)	۱۴۲
اقبال کی شاعری بحیثیت شاعر کے	۳۹	معراج	۱۲۶	" (۱۴)	۱۴۳
ضرب کلیم	۴۸	علم و عشق	۱۲۶	" (۲۰)	۱۴۳
ارمغان حجاز	۴۹	تقدیر	۱۲۷	" (۲۴)	۱۴۴
اقبال کا فلسفہ	۵۱	ابلیس و یزدان	۱۲۷	" (۲۶)	۱۴۵
اقبال کا پیام	۶۳	مرد مسلمان	۱۲۸	بال جبریل:-	
حصۂ نظم: بانگ درا		سلطان ٹیپو کی وصیت	۱۲۹	مسجد قرطبہ	۱۴۸
ہمالہ	۷۱	شعاع امید	۱۲۹	لینن (خدا کے حضور میں)	۱۵۵
تصویر درد	۷۴	فنون لطیفہ	۱۳۰	فرشتوں کا گیت و فرمان خدا	۱۵۸
نیا شوالہ	۸۱	غزلیات	۱۳۰	ذوق و شوق	۱۵۹
محبت	۸۲	بال جبریل:-		ایک نوجوان کے نام	۱۶۲
حقیقت حسن	۸۳	قطعہ (۱)	۱۳۰	ساقی نامہ	۱۶۵
گورستان شاہی	۸۳	" (۲)	۱۳۱	فرشتے آدم کو جنت سے	
فلسفۂ غم	۸۷	" (۳)	۱۳۲	رخصت کرتے ہیں	۱۶۹
وطنیت	۸۹	" (۶)	۱۳۳	روح ارضی آدم کا	
شکوہ	۹۰	" (۷)	۱۳۳	استقبال کرتی ہے	۱۶۹
شمع و شاعر	۹۷	" (۱۰)	۱۳۴	جبریل و ابلیس	۱۷۰
جواب شکوہ	۱۰۶	" (۱۱)	۱۳۵	محبت	۱۷۲
ارتقا	۱۱۴	" (۱۲)	۱۳۶	ارمغان حجاز:-	
میں اور تو	۱۱۴	" (۱۳)	۱۳۷	مسعود مرحوم	۱۷۲
خضر راہ	۱۱۵	" (۱۶)	۱۳۸	آواز غیب	۱۷۵

حیاتِ اقبال

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ آپ کشمیری برہمنوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سوا دو سو سال قبل آپ کے جد اعلیٰ ایک مسلمان درویش کے معتقد ہو کر مسلمان ہوئے اور کشمیر سے ترک وطن کر کے پنجاب کے مقام سیالکوٹ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف تربیت کے لحاظ سے نہایت خوش قسمت تھے۔ ان کے والدین گہرے مذہبی تھے۔ دونوں کے اخلاق بھی بہت اعلیٰ تھے۔ ان کے والد نور محمد صاحب صوفی منش تھے اور اپنی دینداری اور اخلاقی پاکیزگی کے باعث سیالکوٹ اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں قابل احترام سمجھے جاتے تھے۔ ان کی مذہبیت و روحانیت کے جو اثرات شروع ہی میں اس ہونہار بچہ پر پڑے، وہ زندگی بھر قائم و راسخ رہے۔ اقبال نے متعدد مقامات پر اپنے والد کے فیض تربیت کا ذکر انتہائی ممنونیت کے لہجہ میں کیا ہے۔ مثلاً ان کی مشہور فارسی مثنوی رموز بیخودی میں تفصیل کے ساتھ ان کی طالب علمی کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ ایک بار کسی فقیر نے دروازے پر بھیک مانگنے کے لئے صدا لگائی۔ اور کسی طرح وہاں سے نہ ٹلا۔ ڈاکٹر صاحب کو اس کی ضد پر غصہ آگیا اور اسے وہ مار بیٹھے۔ منظر دیکھ کر رقیق القلب باپ کے آنسو جاری ہو گئے اور اسی عالم میں وہ نصیحت کرنے لگے کہ قیامت کے دن جب رسول اللہ صلعم کے ارد گرد ساری امت اسلامیہ جمع ہوگی۔ اس

وقت یہ مظلوم فقیر تمہارے اس ظلم کی فریاد کرے گا تو میں رسول اللہ صلعم کے سامنے اس کا کیا جواب دوں گا۔ اے نورِ نظر تو امتِ محمدی کا ایک فرد ہے۔ تجھے اخلاقِ محمدی سے بہرہ ور ہونا اور سراپا شفقت و رحمت بننا چاہیئے نہ کہ ظلم و فرعونیت کا نمونہ۔ اقبال کے دل پر یہ نصیحت اثر کر گئی اور اس کا تاثر زندگی بھر نمایاں رہا۔

اس طرح قرآن مجید کی تلاوت اور اسے تاثر کے ساتھ پڑھنے کی نصیحت نے۔
"کہ بیٹا جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھ کر کہ قرآن تم ہی پر اترا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔"

اقبال کو قرآن مجید کا ابتدا ہی سے سچا قدردان بنا دیا تھا۔ قرآن کی تلاوت وہ ہمیشہ بڑے ذوق و شوق سے کرتے تھے، اور اس سے بے انتہا متاثر ہوتے تھے، ان کے کلام میں اسی لئے قرآنی تلمیحات و تعلیمات قدم قدم پر ملتی ہیں۔

اقبال کی والدہ بھی نہایت دیندار خاتون تھیں، ان کی تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ والدہ کے انتقال پر اقبال نے جو دردناک مرثیہ لکھا ہے۔ اس میں ماں کی تربیت کا اعتراف انتہائی تشکر کے ساتھ کیا ہے ؎

تربیت سے میں تری انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

ابتدائی تعلیم قدیم طرز کے مکتب میں حاصل کرنے کے بعد مشن اسکول سیالکوٹ میں داخل ہوئے۔ ابتدا ہی سے ان کی قابلیت کے جوہر نمایاں تھے،

متعدد ابتدائی درجوں کے امتحان میں فرسٹ آنے کے بعد مڈل اور انٹرنس کے امتحانات میں بھی سرکاری وظیفہ کے مستحق ٹھہرے۔ اقبال کی خوش قسمتی سے اس زمانے میں انھیں عربی و فارسی کے ایک بہت ہی قابل اُستاد، مولانا سید امیر حسن ہاتھ آگئے جن کی تعلیم کا خلاصہ یہ تھا کہ جو لوگ اُن سے عربی یا فارسی کی تعلیم حاصل کرتے تھے ان کی طبیعت میں وہ اس زبان کا نہایت صحیح مذاق پیدا کر دیتے تھے۔ اقبال نے یہ دونوں زبانیں اس فاضل استاد سے سیکھیں اور ان میں کمال حاصل کیا۔ اعلیٰ مذہبی و اخلاقی تربیت والدین کے آغوش تربیت و ظلِ عاطفت میں مل چکی تھی۔ علمی قابلیت و استعداد اس فاضل و شفیق استاد کے فیض صحبت سے حاصل ہوئی۔ اسکول طالب علمی ہی کے زمانہ سے اقبال کی شاعری کا آغاز ہو گیا تھا اور وہ بھی بڑی حد تک اس اُستادِ گرامی قدر کی رہین منت تھی اقبال اپنے استاد کا اتنا احترام کرتے تھے کہ جب حکومت نے انھیں "سر" کے خطاب سے سرفراز کرنا چاہا تو انھوں نے اسے اس شرط پر قبول کیا کہ ان کے استاد کو بھی "شمس العلماء" کے خطاب سے نوازا جائے۔ حکومت نے ان کی یہ شرط منظور کی۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو ان کے ان فاضل استاد نے اس حال میں وفات پائی کہ ان کے اس ہونہار شاگرد کی شہرت ملک کے اندر اور باہر بخوبی ہو چکی تھی۔

طالب علمی ہی کے زمانہ میں اردو کے مشہور شاعر و استاد، فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی (جو اس وقت نظام دکن میر محبوب علی خاں مرحوم کے اُستاد تھے) کے پاس اپنی بعض غزلیں بغرض اصلاح ڈاک سے ارسال

کیں۔ ان کی ابتدائی غزلوں ہی سے داغ کی نگاہ نکتہ رس یہ پہچان گئی کہ یہ کسی معمولی طالب علم کا ذہنی مشق کا کلام نہیں۔ اور چند ہی غزلوں پر نظر اصلاح ڈالنے کے بعد انھوں نے کہہ دیا کہ اس کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت ہی کم ہے۔ اُستادی و شاگردی کا یہ تعلق بہت تھوڑی مدت تک قائم رہا لیکن اس کی یاد طرفین میں باقی رہ گئی۔ داغ کی زندگی ہی میں اقبال کی ملک میں شہرت ہو چکی تھی اور اس بنا پر داغ مرحوم فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں ہیں جن کے کلام کی اصلاح میں نے کی ہے۔ اور خود اقبال نے داغ کے انتقال پر جو مرثیہ لکھا ہے وہ نہ صرف ان کے جذبات غم کو ظاہر کرتا ہے بلکہ داغ کی شاعرانہ عظمت کو بھی زندہ جاوید بنانے والا ہے ؎

بلبل دلی نے باندھا اس چمن میں آشیاں
ہم نوا ہیں سب عنادل باغ ہستی کے جہاں
چل بسا داغ آہ میت اس کی زیب دوش ہے
آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے
تھی زبان داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلیٰ معنی وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے
اب صبا سے کون پوچھے گا سکوت گل کا راز
کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز؟

ایف اے تک تعلیم اقبال نے سیالکوٹ ہی میں حاصل کی۔ اس سے آگے کی تعلیم کا انتظام وہاں نہ تھا۔ اس لئے وہ لاہور چلے آئے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے کلاس میں داخل ہو گئے۔ یہاں ان کی خوش قسمتی سے مشہور مستشرق پروفیسر سر ٹامس آرنلڈ، فلسفہ کے پروفیسر تھے، جو اس سے قبل ایم اے او کالج علیگڈھ میں پروفیسر رہ چکے اور اسلامی علوم سے خوب واقفیت حاصل کر چکے تھے۔ اقبال کو فلسفہ سے بہت دلچسپی تھی۔ پروفیسر آرنلڈ کی خصوصی

توجہ نے ان کی قابلیت کو درجہ کمال پر پہونچا دیا، ڈاکٹر صاحب نے بی اے کا امتحان امتیاز خاص کے ساتھ پاس کیا، جس کے صلہ میں ماہوار وظیفہ کے ساتھ انھیں دو طلائی تمغے بھی ملے۔ اس کے بعد وہ ایم اے میں بھی اول آئے اور نانک بخش میڈل کے مستحق ٹھہرے۔ ان کی قابلیت سے پروفیسر آرنلڈ بہت متاثر تھے۔ دونوں میں انتہائی محبت قائم ہو گئی تھی۔ آرنلڈ کو ناز تھا کہ میری محنت ٹھکانے لگی اور میرا یہ شاگرد علمی دنیا میں میرے نام کو روشن کرنے والا ثابت ہوا۔ عربی و فارسی علوم میں مولانا میر حسن اور مغربی علوم کی تحصیل و تکمیل میں پروفیسر آرنلڈ کی مشفقانہ رہبری اقبال کو اوج اقبال پر پہونچانے کا خاص ذریعہ بنی۔

پروفیسر آرنلڈ ۱۹۰۴ء میں انگلستان واپس چلے گئے۔ لیکن اقبال کے دل میں ایسا علمی ذوق پیدا کر گئے کہ جلد ہی وہ مغربی تعلیم کی تکمیل کے لئے ۱۹۰۵ء میں انگلستان روانہ ہو گئے۔ اس درمیانی مدت میں وہ اول اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ، فلسفہ اور سیاسیات کے پروفیسر اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر رہے۔ پروفیسر آرنلڈ جس وقت لاہور سے رخصت ہوئے تھے، اقبال نے نالۂ فراق کے عنوان سے ایک موثر نظم لکھی تھی اور ان کی صحبت سے محرومی پر انتہائی قلق کا اظہار کرتے ہوئے یہ تمنا ظاہر کی تھی کہ جلد ہی وہ بھی انگلستان پہونچ کر اُن سے مزید فیض حاصل کریں گے ؎

کھول دیگا دشت وحشت عقدۂ تقدیر کو توڑ کر پہونچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو　　کیا تسلی ہو مگر گرویدۂ تقریر کو

انگلستان پہونچ کر اقبال وہاں کے مشہور دارالعلم کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوئے یہاں انھوں نے نامور اساتذۂ فن ڈاکٹر میک ٹیگارٹ (جو مشہور فلسفی ہیگل کا متبع تھا) ادب فارسی کے مشہور مورخ اے. جی براؤن. ڈاکٹر نکلسن اور پروفیسر وارڈ سارلے سے علمی فیوض حاصل کئے. ان کے یہ اساتذہ بھی اقبال سے نہایت درجہ متاثر ہوئے پروفیسر نکلسن نے تو انکی فارسی مثنوی اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ کرکے اقبال کو یورپ کے اہل فکر سے روشناس کیا. تین سال کی مدت یورپ میں طالب علمانہ حیثیت سے گذاری، بیرسٹری کا امتحان پاس کیا. کیمبرج یونیورسٹی اور جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں. جرمنی سے واپس آکر لندن سے اسکول آف پولیٹکل سائنس میں داخل ہوئے. ۶ ماہ تک لندن یونیورسٹی میں اپنے استاد ڈاکٹر آرنلڈ کی جگہ قائم مقام پروفیسر بھی رہے. ۳۲ سال کی عمر میں اعلیٰ علمی اعزازات اور ڈگریوں سے مالامال ہوکر وطن واپس آئے اور لاہور میں بیرسٹری شروع کی اور لاہور کے گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر اٹھارہ ماہ تک رہے ڈاکٹر صاحب کے علمی اشاغل اور بیرسٹری میں کوئی رابطہ نہ تھا. لیکن چونکہ یہ آزاد پیشہ تھا. اس لئے وہ اس کو اختیار کئے رہے حالانکہ بیرسٹری کے بہترین زمانہ میں بھی ان کی آمدنی اکثر ہزار ماہوار سے آگے بڑھ نہ سکی. گورنمنٹ نے انھیں انڈین ایجوکیشنل سروس میں کوئی اونچی جگہ جو اس زمانہ میں بالعموم یورپینوں کے لئے مخصوص رہتی تھی دینا چاہی لیکن ڈاکٹر صاحب کو گورنمنٹ کالج لاہور کے زمانہ ملازمت میں ایسے تلخ تجربات ہوئے تھے جن کی بنا پر وہ یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہو گئے،

کہ ہندوستانی کالجوں کی پروفیسری میں علمی کام تو ہوتا نہیں البتہ ملازمت کی ذلتیں ضرور سہنی پڑتی ہیں۔ حیدرآباد دکن میں عثمانیہ یونیورسٹی جب قائم ہوئی تو اس کی پرنسپلی کے لئے اور اس سے قبل قانون کی پروفیسری کے لئے ان کو بلانے کی کوشش کی گئی لیکن انھوں نے اسے منظور نہ کیا۔ البتہ وہ حیدرآباد ہائی کورٹ کی ججی کے خواستگار تھے لیکن یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد کی کوششوں کے باوجود یہ عہدہ انھیں نہ مل سکا۔

یورپ جانے سے قبل ان کی شاعری کا دائرہ ہندوستان تک اور یہاں کی قومی اور وطنی نظموں تک محدود تھا۔ اس لئے ان کی شاعری اردو ہی میں ہوتی تھی۔ لیکن یورپ سے واپسی کے بعد ان میں تبدیلی ہوئی اور اب زیادہ تر وہ فارسی میں لکھنے لگے۔ ان کی اردو شاعری کا آغاز بقول سر عبد القادر مرحوم سنہ ۱۹۰۱ء سے چند سال قبل ہو گیا تھا۔ لاہور کے مشاعروں میں وہ ایک غزل گو کی حیثیت سے نمودار ہوئے تھے۔ اس کے بعد لاہور میں ایک ادبی مجلس قائم ہوئی جس میں انھوں نے اپنی نظم کوہ ہمالہ (جسے اپنی نظمیہ شاعری کا سنگ بنیاد سمجھنا چاہیے) سنائی۔ اس نظم میں خیالات انگریزی تھے لیکن بندشیں فارسی کی تھیں۔ وطن دوستی بھی اس کے ہر ہر شعر سے ترشح ہو رہی تھی۔ یہ نظم پہلے پہل اپریل سنہ ۱۹۰۱ء میں اردو کے مشہور رسالہ مخزن میں جس کے اڈیٹر سر شیخ عبد القادر مرحوم تھے شائع ہوئی اور اس طرح ان کی پبلک شاعری کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد اس رسالہ میں ان کا کلام پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ رفتہ رفتہ لوگ ان کے اس جوہر سے واقف اور ان کے کمال شاعری کے معترف ہوتے گئے۔ رسالوں اور اخباروں سے ان کے کلام کی فرمائشیں

آنے لگیں۔ قومی انجمنیں اُن سے اپنے جلسوں میں نظمیں سنانے کی درخواستیں کرنے لگیں۔ لاہور کی مشہور انجمن حمایت اسلام اس لحاظ سے بہت ہی خوش نصیب رہی کہ اس کے سالانہ جلسوں میں متواتر کئی سال انھوں نے اپنی معرکہ الآرا نظمیں شکوہ، جواب شکوہ وغیرہ سنائیں۔ ابتداءً وہ اپنی نظمیں تحت اللفظ سناتے تھے لیکن بعد میں دوستوں کے اصرار پر ترنم سے سنانے لگے چونکہ ان کی آواز نہایت بلند اور خوش آیند تھی اس لئے ان کا طرز بہت مقبول ہوا۔ انجمن حمایت اسلام کے بعض بعض جلسوں میں دس دس ہزار کا مجمع ان کی نظموں کو سننے کے لئے جمع ہو جاتا تھا۔ اور سب سامعین پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔

دوران قیام یورپ میں ایک بار انھوں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ شاعری ترک کر دیں گے اور جو وقت شاعری میں صرف ہوتا رہا ہے وہ کسی اور مفید کام میں صرف کر دیا کریں گے لیکن پروفیسر آرنلڈ نے ان کے اس ارادہ سے اتفاق نہ کیا لیکن اس وقت سے وہ اردو کے بجائے عموماً فارسی میں کہنے لگے اور اردو نظمیں کبھی کبھی کہتے رہے۔

فارسی میں ان کی مثنوی اسرار خودی ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ اور اس نے انھیں ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے شہرت دی۔ یہ مثنوی ہندوستان سے کہیں زیادہ انگلستان و یورپ میں مقبول ہوئی۔ پروفیسر نکلسن نے اس کا انگریزی ترجمہ مع تمہیدی مقدمہ کے شائع کیا، اور بڑے بڑے انگریز نقادوں نے انگلستان کے بلند پایہ علمی رسائل میں اس کے تعارف و تبصرہ کے سلسلہ میں گرانقدر خیالات

ظاہر کیے۔ حکومت انگریزی نے اس سے متاثر ہو کر انھیں ۱۹۱۳ء میں سر کا خطاب دیا۔

پہلے وہ عملی سیاست سے بالکل بے تعلق رہتے تھے اور احباب کے اصرار پر یہ کہا کرتے تھے ؎

ہوس بھی ہو تو نہیں مجھ میں ہمت تگ و تاز حصول جاہ ہے وابستہ مذاق تلاش
ہزار شکر طبیعت ہے ریزہ کار مری ہزار شکر نہیں ہے دماغ فتنہ تراش
یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں کہ فیض عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

لیکن ۱۹۲۶ء میں پہلی بار وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی ممبری کے لئے لاہور کے حلقۂ انتخاب سے کھڑے ہوئے اور اپنے حریف کے مقابلہ میں تین ہزار ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ پنجاب کونسل کے دوران رکنیت میں انھوں نے بہت سے کارنمایاں انجام دیے مثلاً بانیان مذاہب پر توہین آمیز اور کمینہ حملوں کی روک تھام کے لئے قانون وغیرہ۔

۱۹۲۸ء میں آپ نے مدراس میں انگریزی مدارس کے طلبہ کے سامنے مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن جنوبی ہند کے زیر اہتمام انگریزی میں اسلام پر فلسفیانہ لکچر دیے جو ریکنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ ان اسلام کے نام سے ۱۹۳۰ء میں اول بار شائع ہوئے اور اپنے موضوع کے اعتبار سے بالکل اچھوتے اور نہایت محققانہ ہیں۔

دسمبر ۱۹۳۰ء میں اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد کے صدر منتخب ہوئے، اور اسی کے خطبہ

صدارت میں انھوں نے پہلی بار نظریۂ پاکستان پیش کیا، جو اُس وقت محض ایک شاعرانہ تخیل سمجھا گیا تھا۔

مسلم لیگ کی صدارت کے تھوڑے ہی دنوں بعد انھیں مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے دوسری گول میز (راؤنڈ ٹیبل) کانفرنس میں جو ہندوستان کو مزید آئینی اصلاحات دینے کے لئے طلب کی گئی تھی، مدعو کیا گیا، اور اس کانفرنس میں انھوں نے مسلم نمائندگی کے فرائض ادا کئے۔ ان کانفرنس کی شرکت کے بعد وہ فرانس اور اٹلی وغیرہ بھی گئے اور وہاں کے اکابر اہل علم و اہل سیاست سے ملے۔ اٹلی کے ڈکٹیٹر سائنور مسولینی کا ستارہ اس وقت عروج پر تھا۔ وہ بھی اقبال کی اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ پڑھ چکنے کے باعث اقبال کے پیام سے خاصہ متاثر تھا۔ اس نے ڈاکٹر صاحب سے اٹلی کے نوجوانوں کے لئے پیام نصیحت طلب کیا آپ نے یہ نصیحت فرمائی کہ

"اطالیہ ابھی ایک نوجوان قوم ہے اگر وہ صحیح راہ اختیار کرنا چاہتی ہے تو اسے مغرب کی زوال آمادہ تہذیب سے منہ موڑ کر مشرق کی روحانی و زندگی بخش تہذیب کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔"

اقبال اس انقلابی روح سے بہت متاثر ہوئے جو مسولینی نے اس وقت باشندگان اٹلی میں پیدا کر رکھی تھی۔ اپنی ایک نظم میں وہ اس تاثر کا اظہار کرتے ہیں ؎

رومۃ الکبریٰ دگرگوں ہو گیا تیرا ضمیر   اینکہ می بینم بہ بیداری ست یارب یا بخواب

چشم پیران کہن میں زندگانی کا فروغ — نوجواں تیرے ہیں سوز آرزو سے سینہ تاب

اٹلی کے اہل علم بھی اقبال کے کلام و پیام سے بہت متاثر ہوئے۔ وہاں کی سب سے بڑی اکاڈمی نے اپنے یہاں ان سے تقریر کرائی اور ان کے کلام کے بعض اجزا کا ترجمہ بھی اٹالین زبان میں کیا گیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اسپین (ہسپانیہ) کا بھی سفر کیا جو عرصہ تک قدیم عربی و اسلامی تہذیب کا مرکز رہ چکا تھا۔ وہاں کے دوران قیام میں انہوں نے بوئے یمن سونگھی اور ان کے کانوں نے وہاں کی نواؤں میں رنگ حجاز محسوس کیا ؎

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے — رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

اسپین سے واپسی میں آپ فلسطین گئے اور بیت المقدس میں منعقد ہونے والی موتمر عالم اسلامی میں شریک ہوئے۔

۱۹۳۳ء میں آپ نے ایک اور مسلم ملک افغانستان کا سفر وہاں کے تاجدار نادر شاہ کی دعوت پر کیا۔ شاہ مرحوم افغانستان کے مذہبی و تعلیمی امور کے متعلق ہند کے مسلم فضلاء و ماہرین سے مشورہ چاہتے تھے۔ اس سفر میں تین مسلم اکابر ہندوستان سے گئے (۱) ڈاکٹر سر محمد اقبال (۲) سر راس مسعود اور (۳) مولانا سید سلیمان ندوی (افسوس کہ اب یہ تینوں اکابر اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں)۔ اس سفر کے تاثرات اقبال کی دور آخر کی مشہور فارسی مثنوی "مسافر" میں تفصیل کے ساتھ ، ،، کابل میں شاہی مہمان کی حیثیت سے رہے۔ وہاں کی علمی مجالس میں آپ کا خاص طور سے

استقبال کیا گیا۔

سفر افغانستان سے مراجعت کے کچھ عرصہ بعد اس علالت کا سلسلہ شروع ہوا جو بالآخر ۱۹۳۸ء میں مرض الموت ثابت ہوئی۔ ابتدا حلق کی شکایت نزلہ کے اثرات سے ہوئی۔ بعد میں ڈاکٹروں کی تشخیص قلب کے ایک خطرناک مرض کی ہوئی۔ دہلی کے نامور طبیب حکیم حافظ عبدالوہاب المعروف حکیم نابینا کے علاج سے کئی بار مرض میں افاقہ ہو گیا۔ لیکن اس کا استیصال نہ ہوا۔ ۱۹۳۸ء میں مرض نے اور شدت اختیار کی اور قلبی درد کے دورے جلد جلد ہونے لگے اس کے بعد ہی استسقا کی علامات رونما ہوئیں۔ وفات سے ایک دو روز قبل جب ڈاکٹروں نے حالت اندیشہ ناک بلکہ مایوس کن بتائی تھی، آپ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے آپ کی تسلی کے لئے کچھ کہنا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ میں مسلمان ہوں، موت سے نہیں ڈرتا اور معاً بعد اپنا یہ مشہور شعر سنایا ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

۲۱ را پریل ۱۹۳۸ء کو وفات سے چند گھنٹہ قبل شدید کرب کے عالم میں اپنی فارسی رباعی پڑھی ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

وفات کی خبر مشہور ہوتے ہی لاہور میں کہرام مچ گیا۔ شہر کی دوکانیں اظہار تعزیت میں بند ہو گئیں۔ جنازہ ہزاروں کے مجمع نے اٹھایا۔ نعش لاہور کی مشہور و معروف شاہی مسجد کے باہر حضوری باغ کے کونہ میں دفن کی گئی۔

اس عظیم المرتبت شاعر کا ماتم تنہا لاہور اور پنجاب تک محدود نہیں رہا۔ ملک کے طول و عرض میں اس حادثہ پر رنج و تعزیت کا اظہار کیا گیا ہے ہندو مسلم اختلافات کی شدت کے باوجود ہندو اور سکھ اکابر نے بھی اس بڑے ملکی شاعر کا سوگ منایا اور ان کے اکابر نے تعزیتی پیامات ارسال کئے۔ ملک کے باہر علمی حلقوں میں اس سانحہ پر اظہار تعزیت کیا گیا متعدد رسالوں نے بڑے بڑے ضخیم تعزیتی نمبر شائع کئے جن میں رسالہ اردو کا اقبال نمبر اور علیگڑھ میگزین کا اقبال نمبر خاص طور سے قابل ذکر ہیں شعرا نے کثرت سے تاریخہائے وفات کہیں۔ صاحب حیات اقبال کا دعویٰ ہے کہ آج تک کسی شخص کی وفات پر اتنی تاریخیں نہیں کہی گئیں اقبال کے ایک ہم عصر شاعر خواجہ دلی محمد صاحب نے ایک ہی شعر میں عیسوی اور ہجری دونوں تاریخیں بڑی خوبی سے نکالی ہیں ؎

"شمع خاموش" سال ہجری ہے

۱۳۵۷ھ

عیسوی "شمع شاعری خاموش"

۱۹۳۸ء

اقبال کی ذاتی زندگی بھی اعلیٰ قسم کی اور معیاری تھی۔ بحیثیت مذہبی اور پان اسلامزم (اتحاد بین الاسلامی) کے مبلغ اعظم ہونے کے باوجود ان میں کسی دوسرے مذہب کے ماننے والوں سے کوئی بغض و تعصب نہ تھا۔ ان کی ملیت کے جذبات وطنیت سے متصادم نہیں ہوتی تھی۔ فرقہ وارانہ

تعصب سے انھوں نے ہمیشہ اظہار برات کیا ہے۔

تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینے خانے میں　　یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

اُجاڑا ہے تمیز ملت و آئین نے قوموں کو　　مرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اُٹھا دیں　　بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی　　آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے

دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

رام چندر جی کی شان میں ان کی ایک مشہور نظم بانگ درا میں شامل ہے اس میں کہتے ہیں سے

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز　　اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی　　روشن تر از سحر ہے زمانے میں شام ہند

سکھوں کے رہنما گرو نانک کی شان میں فرماتے ہیں سے

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے　　ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

ان کا ترانہ ہندی سے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا　　ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

آج بھی اس موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس کا یہ مصرعہ تو ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے ع

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

اس کے بعد یورپ کے قیام کے زمانے میں انھوں نے وطن پرستی کے خطرناک

نتائج کا مشاہدہ کیا اس کے بعد وہ مذہبیت ۔ وروحانیت کے مبلغ ہوئے لیکن جس مذہب کی انھوں نے تبلیغ کی وہ فرقہ آرائیوں سے الگ۔ اور بین الاقوامیت کی دعوت کا حامل تھا۔

عموماً ہمارے ملک کے نوجوان جو اس زمانہ میں حصول تعلیم کے لئے یورپ جاتے تھے وہاں سے واپس آکر مذہب سے بیگانہ و باغی ہو جاتے تھے عقائد و اعمال سبھی میں یورپ کے مقلد ہو جاتے تھے۔ اقبال ظاہری صاحبیت کے باوجود اپنے ٹھیٹھ اسلامی عقائد و اعمال پر قائم رہے۔ قرآن مجید کے تو وہ عاشق زار تھے، ذات رسولؐ سے محبت و عقیدت انتہا کو پہونچی ہوئی تھی، احکام اسلام کے اتنی شدت سے پابند تھے کہ دوران قیام یورپ ہمیشہ غیر اسلامی طریقہ سے ذبح شدہ جانور کے گوشت کھانے سے اجتناب کرتے رہے۔ آخر زمانہ میں وہ تو بہت ہی پختہ مذہبی ہو گئے تھے۔ نماز پنجگانہ کے علاوہ نماز تہجد کے بھی پابند ہو گئے تھے۔ حج بیت اللہ اور زیارت روضہ رسولؐ کا اشتیاق انھیں ہمیشہ حد سے زیادہ رہا۔ لیکن افسوس مختلف اسباب سے ان کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔ تاہم ان کے کلام خصوصاً فارسی کلام میں سفر حج کا انتہائی وجد آفریں تذکرہ موجود ہے۔

ان کے رفقاء و احباب اس بات پر متفق اللفظ ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے اخلاق و عادات بالکل درویشانہ تھے۔ طرز معاشرت نہایت سادہ اور تکلفات سے پاک تھا۔ غذا بہت سادہ اور معمولی کھاتے تھے۔ انتہائی غیور اور خود دار تھے، ایک بار ان کی زندگی میں یہ تحریک شروع ہوئی کہ دو لاکھ کی رقم

جمع کر کے ان کی خدمت میں پیش کی جائے تاکہ وہ فکر معاش سے بے نیاز ہو جائیں اقبال کو جوں ہی اس کا علم ہوا، انھوں نے سختی سے اس تحریک کو رکوا دیا۔

ان کے آخر زمانہ میں شدید علالت کے باعث بیرسٹری، جو ان کا ذریعہ آمدنی تھی، ترک ہو گئی تھی۔ اس آخری دور میں نواب صاحب بھوپال نے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ اسی زمانے میں متعدد کوششیں آپ کے احباب نے کیں کہ آپ مزید وظیفے قبول کر لیں، لیکن آپ نے ہر بار یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "میں ایک فقیر آدمی ہوں، مجھے جو کچھ اعلیٰ حضرت نواب بھوپال دیتے ہیں۔ میرے لئے کافی ہے۔"

اسی زمانہ میں حیدر آباد میں یوم اقبال بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ اور ایک ہزار روپیہ کا ایک چک علامہ کی خدمت میں ارسال کیا گیا، آپ نے اسی استغنا اور خودداری کے جذبے کے ماتحت اسے واپس فرما دیا۔

بلند پایہ فلسفی اور عالی مرتبت مفکر ہونے کے باوجود آپ تنہائی پسند بالکل نہ تھے، ہر قسم کے لوگوں سے ملتے اور ہر شخص سے اس کے مذاق کے موافق گفتگو کرتے تھے۔ آپ کی کوٹھی کا دروازہ امیر و غریب، عالم و عامی، سب کے لئے کھلا ہوا تھا، جس سے آپ ملتے بے تکلفی کے ساتھ ملتے اور آپ کی صحبت میں بیٹھنے والا ہر شخص آپ کے انکسار و حسن خلق کا گہرا نقش دل پر لے کر اٹھتا۔

تصنیفات

علامہ اقبال کو اصلی شہرت شاعر کی حیثیت سے ہوئی اور بہت کم لوگ

یہ جانتے ہوں گے کہ ان کی سب سے پہلی کتاب نظم میں نہیں نثر میں "علم الاقتصاد" (معاشیات) کے موضوع پر شائع ہوئی جو اس موضوع پر اردو میں پہلی مستند و محققانہ کتاب تھی۔ اس کے دیباچے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پروفیسر آرنلڈ کے ایما سے یہ کتاب لکھی گئی اور کتاب کے بعض حصوں کی زبان پر علامہ شبلی نعمانی نے بھی اصلاحی نظر ڈالی تھی۔

اس کے بعد جب وہ بہ سلسلہ تعلیم انگلستان گئے تو فلسفۂ ایران پر انگریزی میں ایک ضخیم مقالہ لکھا جس پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی تھی۔

ان کی اردو نظمیں شکوہ، جواب شکوہ، تصویر درد، نالۂ یتیم، خضر راہ، ترانا وغیرہ کثرت سے چھپیں اور سارے ملک میں مقبول ہوئیں، لیکن پہلے مجموعۂ کلام کی اشاعت کی نوبت بہت بعد میں آئی۔ سب سے پہلے ان کی معرکۃ الآرا فارسی مثنوی اسرار خودی ۱۹۱۵ء میں چھوٹے سائز پر شائع ہوئی اور یورپ و امریکہ میں آپ کی شہرت کا خاص ذریعہ بنی۔

۱۹۱۸ء میں دوسری مثنوی رموز بے خودی کے نام سے شائع ہوئی اس کے بعد مشہور جرمنی شاعر گوئٹے کے مغربی دیوان کے جواب میں آپ کا فارسی مجموعۂ کلام پیام مشرق کے نام سے ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔ جس کے متعلق بعض نقادوں کی رائے ہے کہ اس میں مذکورہ بالا مثنویوں کے مقابلہ میں فلسفیت کم اور شعریت زیادہ ہے۔

اردو کلام کا پہلا مجموعہ بانگ درا کے نام سے ستمبر ۱۹۲۴ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا اس کے ساتھ آپ کے مخلص رفیق سر شیخ عبد القادر مرحوم سابق مدیر مخزن کا نہایت قابل قدر

دیباچہ بھی شامل ہے جو مختصر ہونے کے باوجود اقبال اور ان کی شاعری کے بہترین تعارف کی حیثیت رکھتا ہے۔

بانگ درا کے بعد فارسی کلام کا ایک اور مجموعہ زبور عجم کے نام سے نکلا۔ ۱۹۳۲ء میں ان کی شاعری کو زندہ جاوید بنانے والا جاوید نامہ جو تین سال کی کاوش کا نتیجہ تھا، شائع ہوا جو اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے کی ڈیوائین کامیڈی (طربیہ خداوندی) کا جواب سمجھا جاتا ہے شائع ہوا۔ جنوری ۱۹۳۵ء میں اردو کلام کا دوسرا مجموعہ "بال جبریل" کے نام سے شائع ہوا جسے متعدد اقتباسات سے زبور عجم کا اردو ترجمہ سمجھنا چاہیئے جولائی ۱۹۳۶ء میں اردو کا تیسرا مجموعہ کلام "ضرب کلیم" کے نام سے شائع ہوا۔

اس زمانہ میں فارسی کی ایک چھوٹی سی مثنوی مسافر کے نام سے شائع ہوئی جس میں علامہ نے سیاحت افغانستان کے "تاثرات کا اظہار فرمایا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں دوسری اور اس سے بھی زیادہ دلآویز فارسی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" شائع ہوئی۔

آخری مجموعہ کلام جس کا بڑا حصہ فارسی اور مختصر آخری حصہ اردو میں ہے ارمغان حجاز کے نام سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں ان کی سب سے آخری اردو نظم "حضرت انسان" کے عنوان سے شامل ہے جو انہوں نے ۸ فروری ۱۹۳۸ء کو وفات سے ڈھائی ماہ قبل لکھی تھی۔

اسکے علاوہ نثر میں ان کے انگریزی لیکچروں کا مجموعہ "تشکیل جدید الٰہیات اسلام"۔ Reconstruction of Religious Thought in Islam کے نام سے ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئے۔ اور اس سے قبل ان کے ایک انگریزی

لیکچر کا اردو ترجمہ ان کے نامور معاصر مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر کے عنوان سے عرصہ ہوا شائع ہوا تھا۔

اقبال کے مکاتیب کا مجموعہ اقبال نامہ کے نام سے شائع ہوا ہے جو ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ان کے شاعرانہ تصورات کی بھی بہت کچھ وضاحت کرتا ہے۔

اقبال کو ہندوستان کے باہر دوسرے ملکوں خصوصاً اسلامی ممالک میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے فارسی کلام کی مقبولیت سب سے زیادہ ایران میں ہوئی اور اس کے بعد افغانستان کا نمبر رہا۔ ان کے ترانۂ ملی (چین و عرب ہمارا) کے ایک سے زیادہ ترجمے عربی نظم میں شائع ہوئے۔ ایک مصری سیاح احمد رفعت نے ان کی متعدد نظموں کے ترجمے عربی میں کیے جو مصر کے نامور اخبار الاہرام میں شائع ہوتے رہے۔ مصر کے ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے نغمہ ساربانِ حجاز کا عربی میں ترجمہ کیا اور اقبال کے متعلق متعدد مضامین مصر کے بلند پایہ رسائل میں لکھے۔

ٹرکی میں بھی اقبال کی متعدد نظموں کا ترجمہ کرایا گیا۔ اور ان کے پیام مشرق پر وہاں کے ایک نامور فاضل حسین دانش نے تبصرہ لکھا۔

انگریزی میں ڈاکٹر نکلسن نے آپ کی اسرار خودی کا ترجمہ مع تعارفی مقدمہ کے کیا۔ اس ترجمہ پر تبصرے مشہور انگریز اہل قلم کے قلم سے وہاں کے رسالوں میں نکلے اور ڈاکٹر براؤن نے اپنی مشہور کتاب لٹریری ہسٹری آف پرشیا کی چوتھی جلد میں خاص طور سے ڈاکٹر اقبال کا ذکر کیا۔ پروفیسر آربری نے اقبال کے کلام کے مختلف حصوں کے ترجمے گزشتہ چند سال ہوئے انگریزی میں کئے ہیں،

جرمنی میں پیام مشرق پر متعدد تبصرے نکلے اور اس کے مقدمہ کا ترجمہ بھی جرمن زبان میں ہوا۔ اور اقبال کی تعلیمات و کلام کے ترجمہ و اشاعت کے لئے ایک سوسائٹی بھی وہاں قائم ہوئی تھی۔

روسی اور اطالوی زبانوں میں بھی اسرار خودی کے بعض حصوں کے ترجمے ہوئے۔

اقبالیات

علامہ اقبال اس لحاظ سے نہایت خوش قسمت تھے کہ ان کے حالات و کلام و پیام پر کثرت سے کتابیں لکھی گئیں۔ جن کا سلسلہ اب بھی جاری ہے متعدد رسائل نے ضخیم اقبال نمبر شائع کئے جن میں رسالہ اردو کا اقبال نمبر اپنی نوعیت میں یکتائے روزگار ہے۔ اور رسالہ نیرنگ خیال لاہور کا اقبال نمبر، رسالہ علیگڑھ میگزین کا اقبال نمبر اور جامعہ ملیہ کا جوہر اقبال خاص طور سے مولانا عبدالسلام ندوی۔ اقبال از شیخ احمد دین ایم اے۔ اقبال کا مطالعہ از سید نذیر نیازی، روح اقبال۔ از ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ حیات اقبال شائع کردہ تاج کمپنی لاہور۔ اقبال کی شاعری۔ از عبدالمالک صاحب آروی مرحوم اقبال کا تعلیمی فلسفہ (انگریزی) از خواجہ غلام السیدین۔ شاعر مشرق (انگریزی) از عبداللہ انور بیگ صاحب۔ تعلیمات اقبال۔ از پروفیسر یوسف سلیم۔ اقبال کے کلام کی شرحیں۔ از پروفیسر یوسف سلیم چشتی۔ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اقبال کا پس منظر

اقبال کی شاعری کا پس منظر جاننے کے لئے مسلمانان ہند کی تاریخ (۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد کی) پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اس انقلاب کے ہاتھوں جسے عرف عام میں "غدر" کہا جاتا ہے، مغلیہ سلطنت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ، جس کی روشنی دلی کے لال قلعہ اور اس کے آس پاس کے مختصر علاقہ تک محدود رہ گئی تھی، بھی گل ہو گیا۔ چونکہ مسلمانوں نے اس ناکام انقلاب میں نمایاں حصہ لیا تھا اس لئے فرنگی فاتحوں نے انھیں کو اصل مجرم قرار دے کر انھیں کچلنے اور دبانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ان کی اجتماعیت کو فنا کرنے کے لئے ہر ممکن تدبیر صرف کی گئی۔ دہلی اور بعض بڑے شہروں کو بُری طرح تاراج کیا گیا اور اسی مخبری پر نہ معلوم کتنے مسلمان معززین کو بالکل بے خطا و بے قصور تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔ ان کے صاحبان ثروت کی جائدادیں ضبط کی گئیں۔ نہ معلوم کتنوں کو قید و جلاوطنی کی سزائیں بھگتنی پڑیں۔ مولانا سید احمد شہید اور ان کے پرجوش شاگرد مولانا محمد اسماعیل شہید نے پنجاب اور صوبہ سرحد کے مسلمانوں کو سکھوں کے پنجہ سے چھڑانے کے لئے جو بھی عملی جد و جہد کی تھی، وہ بالاکوٹ کے فیصلہ کن معرکہ میں بعض مسلمانوں ہی کی غداری کے باعث ناکام ہو گئی تھی۔ لیکن اس تحریک کے ماننے والے اور مسلمانوں میں جہادی جذبہ کو زندہ رکھنے والے شمالی ہند میں اب بھی خاصی تعداد میں موجود تھے، اور

حکومت انگریزی کو ان سے ہر وقت اندیشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں یہ علم جہاد نہ بلند کر دیں۔ اس لئے اس نے ان مجاہدین کی تحریک کو وہابی تحریک کا لقب دیکر اسے ہر قسم کے ظلم و ستم سے کچلنے کی پوری کوشش کی۔ نہ صرف یہ کہ بڑے بڑے مقدس اور فاضل علماء کو بغاوت و غدر کے الزام میں پھانسیاں دی گئیں۔ حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزائیں دی گئیں۔ بلکہ انگریز مورخوں اور ارباب سیاست نے اپنے قلم کے ذریعہ انہیں ہر طرح مطعون و بدنام بھی کیا۔ شمالی ہند میں جہاں مسلمان پہلے سیاسی و معاشرتی حیثیت سے خاصے سربلند تھے ہر طرح پست اور ذلیل کئے گئے۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر تقریباً بند کر دیے گئے۔ اس وقت کی ناموافق فضا کو دیکھکر عام خیال یہی قائم ہو گیا تھا کہ اب ہند کے مسلمان پنپنے نہیں پائیں گے۔

اس دور میں سر سید احمد خاں اٹھے اور انھوں نے ایک طرف اسباب بغاوت ہند کا رسالہ لکھکر اس نفرت و بدگمانی کو دور کرنے کی کوشش کی جو مسلمانان ہند کی طرف سے انگریزوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ دوسری طرف انھوں نے عیسائی مصنفین اور مشنریوں کی پھیلائی ہوئی ان غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کی تردید میں قلم اٹھایا جس کا مقصد اسلام اور پیغمبر اسلام حضرت محمد صلعم کی زندگی کو مسخ کرکے پیش کرنا اور اس طرح مسلمانوں کی متاع ایمان پر ڈاکہ ڈالنا تھا سر سید نے اس مقصد کے لیے سیرت نبوی پر ایک جامع کتاب خطبات احمدیہ کے نام سے لکھی جس کے بعض حصوں کا انگریزی ترجمہ بھی انھوں نے انگلستان جاکر شائع کیا۔ ان چیزوں کے ساتھ ساتھ انھوں نے مسلمانوں

کی مادی اصلاح و فلاح کے لئے یہ تحریک پُرزور طریقہ پر چلائی کہ وہ انگریزی تعلیم اور جدید علوم حاصل کریں۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے علی گڈھ میں مسلمانوں کا ایک دارالعلوم (جو ان کے زمانہ میں ایم اے او کالج کہلاتا تھا اور بعد میں ترقی کرکے مسلم یونیورسٹی کے قالب میں آج تک موجود ہے) قائم کیا۔ اس جدید تحریک کی شدید مخالفت مسلمانوں کی طرف سے ہوئی۔ علماء نے تکفیر و تفسیق کے فتوے دیئے۔ ان کے ذاتی عقائد و خیالات کو جو جمہور اُمت سے بہت کچھ الگ تھے اس سلسلہ میں خوب اُچھالا گیا۔ اور یہ کہا گیا کہ جدید تعلیم جو اس نئے مدرسے کے ذریعہ دی جائے گی، مسلمان لڑکوں کے لئے سم قاتل ثابت ہوگی وہ ظاہری وضع و قطع کے لحاظ سے فرنگی بن جائیں گے۔ اور دین اسلام سے برگشتہ و منحرف ہو جائیں گے۔ سر سید احمد خاں نے اپنی تحریک کو عام کرنے کے لئے پہلے ایک رسالہ تہذیب الاخلاق کے نام سے نکالا پھر ایک آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (جس کا نام بعد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کردیا گیا) کی بنیاد ڈالی۔ اور اسکے ذریعہ مسلمانوں خصوصاً ان کے تعلیم یافتہ طبقہ میں بیداری پھیلائی۔ مخالفت کا طوفان کچھ دنوں بعد سرد ہو گیا۔ نیچریت اور لامذہبیت کے الزامات کے باوجود مسلمان سر سید اور ان کے کالج کی طرف کھنچنے لگے اور رفتہ رفتہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اس زمانہ میں مسلمانوں کی سب سے زیادہ نمائندہ جماعت بن گئی۔ اور مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلنے لگی اور یہ اندیشہ بڑی حد تک غلط نکلا کہ علی گڈھ کے پڑھے ہوئے مذہب سے باغی ہوں گے۔ اور عادات و کردار میں تہذیب و تمدن میں بالکل انگریز بن جائیں گے۔

اسی علیگڑھ کالج سے مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں مولانا فضل الحسن حسرت موہانی، وغیرہ پیدا ہوئے جو مذہب اسلام کے پرزور حامی و محافظ ثابت ہوئے اور جنھوں نے سیاست میں بھی مسلمانوں کو آزادی و حریت کے راستوں پر گامزن کیا۔ سرسید نے اپنے زمانہ کے مصالح کے پیش نظر مسلمانوں کو سیاست سے یک قلم کنارہ کشی کا مشورہ دیا تھا۔ اور اس زمانہ میں ملکی مطالبات کے لیے جو انڈین نیشنل کانگرس قائم ہوئی تھی۔ اس سے علیحدگی پر زور دیا تھا۔ سرسید کے جانشین ایک عرصہ تک اس پالیسی پر عامل رہے، لیکن حالات کے بدلنے پر انھیں بھی اپنی اس روش کو بدلنا پڑا تا آنکہ سنہ ۱۹۱۹ء کی تحریک خلافت و ترک موالات نے تو مسلمانوں کو پھر پہلے ہی کی طرح آزادی خواہوں اور حریت طلبوں کا مقدمۃ الجیش بنا دیا۔

سرسید نے انگریزی تعلیم کو مسلمانوں کا ذریعہ فلاح سمجھ کر اس کی تبلیغ شد ومد کے ساتھ کی۔ اسی تحریک میں انھیں متعدد معاون ملے۔ جن میں نواب محسن الملک مولانا الطاف حسین حالیؔ، مولانا نذیر احمد دہلوی۔ مولوی چراغ علی، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مولانا حالیؔ نے اپنی شاعری کے ذریعہ ملک کے عام رجحان میں زبردست تبدیلی کی۔ ان کا شاہکار "مسدس مدوجزر اسلام" جو عرف عام میں مسدس حالی کہلاتا ہے۔ ادب اردو میں زندہ جاوید رہے گا۔ حالی سے ایک حد تک اقبالؔ بھی متاثر ہوئے۔ سرسید کے رفقاء کار میں علامہ شبلی نعمانی بھی تھے۔ لیکن بعد میں انھوں نے یہ محسوس کیا کہ تنہا علی گڈھ کی تحریک تعلیم جدید مسلمانوں کے امراض کا مداوا نہیں بن سکتی۔ اور دارالعلوم

ندوۃ العلماء لکھنؤ کی بنا ڈالی جس کا مقصد ایسے علماء پیدا کرنا تھا جو نہ صرف عربی زبان پر عبور رکھتے ہوں علوم شرعی سے بخوبی واقف ہوں بلکہ ساتھ ہی جدید علوم سے بھی آشنا ہوں اور عصر حاضر کے نت نئے فتنوں کا مقابلہ پامردی و استقامت کے ساتھ کر سکیں۔ ندوہ نے قدیم و جدید کی خلیج پاٹنے میں نمایاں کام کیا۔ ندوہ ہی کے فارغ التحصیل حضرات نے مولانا شبلی کی یادگار میں ملک کا نامور علمی ادارہ دار المصنفین اعظم گڑھ میں قائم کیا جس کی مطبوعات اسلامی تاریخ۔ اسلامی علوم۔ اردو ادب۔ فلسفہ و کلام وغیرہ کے موضوعات پر ایک سے ایک محققانہ و بلند پایہ شائع ہو کر اس ادارہ کی عالمی شہرت کا باعث بن چکی ہیں۔

قدیم عربی درسگاہوں میں دار العلوم دیوبند کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بانیوں نے علی گڑھ تحریک کا مقابلہ کیا۔ قدیم علوم کے تدریسی نظام کو برقرار رکھا۔ آج دنیائے اسلام میں جامع ازہر کے بعد سب سے بڑا عربی مدرسہ یہی ہے۔ ملک کی سیاست میں بھی اس کے اساتذہ و طلبہ نے نمایاں حصہ لیا شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور ان کے جانشین مولانا حسین احمد مدنی۔ مولانا کفایت اللہ وغیرہم اس دار العلوم دیوبند ہی کے تعلیم یافتہ تھے۔ آج بھی جمعیتہ العلماء ہند میں اکثریت انھیں علماء دیوبند کی ہے۔

سرسید ہی کے زمانہ میں پنجاب میں مرزا غلام احمد قادیانی پیدا ہوئے جنھوں نے اولاً غیر مسلم معترضین اسلام عیسائی مشنریوں اور آریہ سماجی مناظروں کے مقابلہ میں کتابیں لکھیں، لیکن بعد میں انھوں نے اپنے متعلق

نئے نئے دعوے شروع کرکے ایک مستقل فرقہ احمدیہ، جسے عرفِ عام میں قادیانی کہتے ہیں، کی بنیاد ڈالدی جو مرزا صاحب کو نبی اور مسیح موعود باور کرتا ہے اس فرقے کے بانی اور ان کے جانشینوں نے حکومت انگریزی کی اطاعت پر چونکہ بہت زور دیا اور مسلمانوں کو ترک جہاد کی تلقین کی۔ اسلئے برطانوی حکومت کی اک گونہ سرپرستی بھی اسے حاصل رہی۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سرسید اور اس کے جانشینوں کی سرپرستی میں ملک کے مختلف حصوں میں سالانہ اجلاس بڑی دھوم دھام سے اس زمانے میں ہوتے رہے۔ اس وقت مسلمانوں کی کوئی قابل ذکر سیاسی تنظیم نہ تھی، اس لئے اس کانفرنس کے سالانہ اجلاس خاص خصوصی اہمیت رکھتے تھے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی ایک تعلیمی جماعت انجمن حمایت اسلام بھی مسلمانوں کی اسلامی اور سماجی خدمات کے لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ اسکے زیر اہتمام پنجاب میں اسلامیہ کالج، یتیم خانے، صنعتی کالج اور دوسرے مختلف ادارے قائم ہوئے۔ اور دوا ور فارسی اور عربی نصاب کی جامع و مفید ریڈریں شائع ہوئیں۔ اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں علامہ اقبال کا بھی نمایاں حصہ ہے۔ دوسری طرف یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس کانفرنس کے اجلاسوں ہی میں نظم خوانی خصوصاً شکوہ، جواب شکوہ، طلوع اسلام وغیرہ کے باعث اقبال کو اتنی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔

سرسید کی وفات کے بعد ایک مختصر مدت کے لئے ان کے صاحبزادے جسٹس سید محمود اور پھر نواب محسن الملک نے ایم اے او کالج اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی زمام قیادت سنبھالی۔ محسن الملک ہی کے زمانہ میں مسلمان سیاست

کے شجر ممنوعہ ہی کے قریب جانے پر مجبور ہوئے اور ۱۹۰۶ء میں مشہور زمانہ شملہ شملہ ڈیپوٹیشن نواب محسن الملک کی سرکردگی میں برطانوی حکومت کے ارباب اختیار کے سامنے مسلمانوں کے جداگانہ سیاسی حقوق کی فہرست لے کر حاضر ہوا کو ایک سیاسی دھچکا، چند سال ہی کے بعد لگا کہ بنگالی ہندوؤں کے ایجی ٹیشن سے حکومت نے متاثر ہو کر بنگال کی تقسیم جو لارڈ کرزن وائسرائے ہند کے زمانہ میں عمل میں آئی تھی، منسوخ کر دی۔ بنگال کی تقسیم شرقی و غربی دو حصوں میں اس وقت عمل میں آئی تھی اور مسلمانوں کے لئے سیاسی اعتبار سے فائدہ مند سمجھی جاتی تھی۔ اس کے کالعدم کئے جانے پر مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ حکومت طاقت کے سامنے جھکتی ہے اور محض وفاداری و اطاعت شعاری کی قدر نہیں کرتی۔ اس احساس کے نتیجہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ نواب محسن الملک کے جانشین نواب وقار الملک ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ خان اور رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر مرحوم اسی جماعت کے بانیوں میں تھے۔

عین اس زمانہ میں اندرونی معاملات کے ساتھ ساتھ ہند کے مسلمانوں کی توجہ دوسرے مسلم ممالک کی طرف وہاں کے سیاسی حالات کے باعث خاص طور سے مبذول ہوئی۔ ہند کے مسلمان ہمیشہ سے پان اسلامزم (تحریک اتحاد اسلامی) کے رجحانات رکھتے تھے۔ مشہور مفکر اسلام سید جمال الدین افغانی نے اپنے افکار کی تبلیغ کے سلسلہ میں ہندوستان میں بھی خاصہ قیام کیا تھا اور اپنے اثرات بہت گہرے چھوڑے تھے۔ یہاں بھی خلافت

اسلامیہ سے جواب عثمانی ترکوں کے پاس تھی اور قسطنطنیہ مرکز خلافت کی حیثیت رکھتا تھا۔ مسلمانان ہند دلی تعلق رکھتے تھے۔ ادھر یورپ کے ممالک جو نئے صنعتی انقلاب اور اپنی چیرہ دست استعماریت کی بدولت بہت طاقت حاصل کر چکے تھے ساری اسلامی حکومتوں خصوصاً خلافت اسلامیہ کو راہ کا کانٹا سمجھ کر اس کے مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ فرانس نے ٹیونس اور الجزائر اور بعد میں مراکش پر ڈاکہ ڈالا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر چڑھائی کی۔ اور کچھ عرصہ کے بعد زار روس کی فوج نے مشہد اقدس پر گولہ باری کی۔ اس سے قبل مہدی سوڈانی کی تحریک حریت کو کچل کر مصر میں برطانوی تسلط کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ ایران روس اور برطانیہ کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو رہا تھا۔ افغانستان ایک حد تک برطانوی اقتدار کے سایہ میں آ چکا تھا۔ اور ترکی کی وسیع سلطنت اب "یورپ کا مرد بیمار" سمجھی جاتی تھی۔ ایک طرف روس اسے ہڑپ کرنے کی فکر میں تھا اور دوسری طرف دول یورپ، جن میں انگلستان اور فرانس سب سے نمایاں تھے۔ ہند کے مسلمانوں نے اس خطرہ کا احساس کیا۔ مولانا ظفر علی خاں کے روزنامہ اخبار زمیندار، مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفتہ وار الہلال اور مولانا محمد علی جوہر کے انگریزی ہفتہ وار کامریڈ اور روزنامہ ہمدرد نے ہند کے مسلمانوں کو اس خطرہ سے (جس سے عالم اسلامی دوچار ہو رہا تھا) خاص طور پر ہوشیار کیا اور ان میں اخوت اسلامی کی تڑپ پیدا کی۔ علامہ اقبال کی نظموں میں عالم اسلام کے ان حوادث کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ ان کی نظموں نے مسلمانوں میں جوش ملی پیدا کرنے میں نمایاں

حصہ لیا۔ ان کے علاوہ مولانا شبلی کی نظمیں بھی اس زمانہ میں بہت مقبول ہوئیں۔ جن میں جنگ بلقان کے متعلق ان کی یہ نظم شہر آشوب اسلام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ اس کا ایک مشہور شعر یہ ہے ؎

مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

طرابلس میں اطالوی چیرہ دستی جاری تھی کہ بلقانی ریاستوں نے ٹرکی کے خلاف دول یورپ کی شہ پاکر علم بغاوت بلند کر دیا۔ مانٹی نیگرو، یونان، بلغاریہ اور رومانیہ اس بغاوت میں شامل تھے۔ ان علاقوں کی مسلم آبادی پر زہرہ گداز مظالم ہوئے۔ اور باغی فوجوں نے ایڈریا نوپل کا ترکی شہر فتح کر کے دارالخلافت قسطنطنیہ (استامبول) کو بھی خطرہ میں ڈال دیا۔ ٹرکی کے مجاہد جلیل غازی انور پاشا اس وقت طرابلس میں اطالوی حملہ آوروں کا مقابلہ بے سروسامانی اور فوج کی قلت کے باوجود انتہائی پامردی سے کر رہے تھے اور ان کے چھکے چھڑا رہے تھے۔ لیکن مرکز خلافت پر یہ آفت آتے دیکھ کر وہ ٹرکی واپس آئے اور کامل پاشا کی کمزور اور اغیار کی آلۂ کار حکومت کا تختہ اُلٹنے میں کامیاب ہوئے اور اس کے بعد انھوں نے بلقانی ریاستوں کو شکستیں دیکر ایڈریا نوپل واپس لے لیا۔ جنگ بلقان کے زمانہ میں مسلمانان ہند نے ٹرکی سے غیر معمولی ہمدردی ظاہر کی۔ انصاری میڈیکل مشن مولانا محمد علی کی تحریک پر مجروحین جنگ کی مرہم پٹی اور تیمارداری کے لئے بھیجا گیا۔ یہ جنگ ابھی ختم نہیں ہونے پائی تھی کہ خود دول یورپ آپس میں لڑ پڑے اور پہلی جنگ عظیم

۱۹۱۴ء میں شروع ہو گئی جس میں ایک طرف جرمنی اور آسٹریا اور دوسری طرف برطانیہ، فرانس اور روس تھے۔ ٹرکی نے جنگ سے دامن بچانا چاہا لیکن حالات ایسے پیدا ہوتے گئے کہ اسے جرمنی کا ساتھ دینا پڑا۔

ادھر اندرون ملک میں بھی مسلمانان ہند کو پیہم صدمات کا سامنا کرنا پڑا مسلم یونی ورسٹی کی تحریک جن توقعات کے ساتھ انھوں نے شروع کی تھی۔ ارباب حکومت نے یونیورسٹی کا چارٹر بناتے وقت ان توقعات کی تکمیل سے انھیں مایوس کر دیا۔ مسلمانوں نے اپنی بے مائگی کے باوجود لکھو کھا کی رقم ہز ہائینس آغا خاں کے دورہ اور ان کے سکریٹری مولانا شوکت علی کی جد وجہد کے نتیجہ میں اس یونیورسٹی کے لئے فراہم کی تھی، توقعات کی ناکامی نے ان کو حد درجہ مایوس اور حکومت کی طرف سے بدظن کر دیا۔ اور ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کے غسل خانہ کے انہدام کا حادثہ پیش آیا۔ مقامی حکام نے نہتے مسلمانوں پر جن میں کمسن بچے اور بوڑھے بھی شامل تھے، گولیاں برسا کر سارے ہندستان میں ایک آگ لگا دی۔ مولانا محمد علی اس وقت تک مسٹر محمد علی کہلاتے تھے، انھوں نے اس موقع پر مسلمانوں کی قیادت کی، اور انگلستان جاکر مسلمانوں کے جذبات و احساسات سے ممبران پارلیمنٹ اور وزراء کو باخبر کیا۔ قتل عام اور گرفتاریاں اور سزایابیوں کے کچھ عرصہ بعد ہند کے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے کسی حد تک مسلمانوں کی اشک شوئی کی اور مسجد کے منہدم شدہ حصہ کی تعمیر عمل میں آئی۔

اس زمانہ میں انجمن خدام کعبہ قائم ہوئی۔ علی برادران مولانا محمد علی اور

مولانا شوکت علی اور ان کے مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی اس کے روح رواں تھے جنگ کے دوران میں حکومت نے مسلمانوں پر خاص سختی کی کیونکہ وہ انہیں خلافت اسلامیہ کا ہمدرد تصور کرتی تھی، الہلال کی ضمانت ضبط کی گئی۔ مولانا محمد علی کو ایک مضمون دی چوائس آف دی ٹرکس لکھنے کے باعث مع ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کے نظر بند کر لیا گیا بعد میں یہ نظر بندی باقاعدہ قید سے بدل دی گئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسرت موہانی بھی نظر بند کر دیئے گئے۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کی ایک جماعت آل انڈیا انجمن اعانت نظر بندان اسلام کے نام سے قائم ہوئی۔

دوران جنگ ہی میں ۱۹۱۶ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس ایک ہی مقام یعنی لکھنؤ میں منعقد ہوئے اور ہندو مسلم تعلقات کو استوار رکھنے کے لئے لکھنؤ پیکٹ (میثاق لکھنؤ) پر لیگ اور کانگریس دونوں کے نمائندوں نے دستخط کئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ تک اس پیکٹ کے مطابق ملک کی مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کو نمائندگی ملتی رہی۔ اس زمانہ میں مسز اینی بسنٹ نے ہوم رول لیگ قائم کی اور اس کا بڑا چرچا رہا اور انھیں بھی گرفتار کر لیا گیا۔

۱۹۱۹ء میں ختم جنگ پر ہندوستان کے لئے منٹو چیمسفورڈ اصلاحات کا اعلان کیا گیا جو ہندوستانی حریت خواہوں کی توقعات سے کہیں کم تھیں۔ اُدھر برطانیہ اور اس کے فاتح حلیفوں نے ٹرکی اور خلافت اسلامیہ کو بالکل ختم کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ معاہدہ سیورے کی رو سے ٹرکی کی حکومت

کے حدود برائے نام رہ گئے تھے۔ دوران جنگ میں کرنل لارنس کی ریشہ دوانیوں سے عربوں نے ترک حکمرانوں کے خلاف بغاوت کر دی تھی، حسین شریف مکہ اور ان کے بیٹے امیر فیصل اور عبداللہ ان باغیوں کے سالار تھے۔ انہیں عربوں کی بغاوت سے ترکوں کے سارے جنگی منصوبے ان کی بے مثل شجاعت کے باوجود ناکام ہو گئے ختم جنگ پر عربوں کو بھی انتہائی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ امیر فیصل جنھیں اولاً شام کا بادشاہ بنایا گیا تھا۔ انہیں فرانس نے شام سے نکال دیا۔ انگریزوں نے ان کی اشک شوئی، نام نہاد شاہ عراق بنا کر کی۔ فلسطین میں وطن یہود کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ مصر میں انگریزی تسلط کا پنجہ اور سخت ہو گیا۔ ترکی کے دارالخلافت قسطنطنیہ میں اتحادی فوجیں، سلطان وحیدالدین کو جو اس وقت تک خلیفہ بھی تھے اپنا تابع حکم بنا چکی تھی، اس وقت مصطفےٰ کمال پاشا نے ایشیائے کوچک (اناطولیہ) میں رہی سہی ترکی فوجوں کو جمع کر کے نئی ترکی حکومت قائم کی، اس حکومت نے یونانی فوجوں کی اس یلغار کو جو ایشیائے کوچک پر قبضہ کے لئے انگریزوں کے ایما و اعانت سے شروع ہوئی بہت بہادری سے روکا۔

ہند کے مسلمان ترکی خلافت کی اس نازک حالت سے صد درجہ متاثر تھے انھوں نے مصطفےٰ کمال کو ہیرو قرار دیکر ترک بہادروں اور مجاہدوں کی ہر قسم کی مدد کی سمرنا فنڈ اور بعد ازاں انگورہ فنڈ میں لاکھوں روپیہ فراہم کر کے ترکوں کو بھیجے گئے ہندوستانی مسلمانوں کا ایک وفد مولانا محمد علی کی قیادت میں انگلستان اور فرانس گیا اور مسلمانان ہند کے مطالبے پوری قوت کے ساتھ مدبرین برطانیہ کے سامنے پیش کئے۔ مگر وہاں فتح کے نشہ میں وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج اور ان کے

رفقا نے وفد کی کوئی بات نہ سنی۔ ہندوستان میں تحریک خلافت اور گاندھی جی کی تحریک ترک موالات (نان کوآپریشن) اس زمانہ میں بڑے زوروں سے شروع ہوئیں۔ مؤخر الذکر تحریک، پنجاب میں برطانوی حکام کے مظالم خصوصاً جلیانوالہ باغ امرتسر کے قتل عام کے ردعمل کے طور پر شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے ملک میں پھیل گئی۔ گاندھی جی نے اس کی بنیاد عدم تشدد اور اہنسا پر رکھی۔ پہلی بار ہندو مسلمانوں میں ایسا اتحاد ہوا جس کی نظیر نہ پہلے موجود تھی، نہ بعد میں قائم ہو سکی۔ یہ تحریک جس کا مقصد ہندوستان کے لیے حصول سوراج اور مسلمانوں کی خلافت اور ان کے اماکن مقدسہ کا تحفظ تھا، دو سال تک بڑے زور شور سے جاری رہی۔ حکومت نے تمام بڑے لیڈروں کو گرفتار کر لیا اور ان کی گرفتاری کے بعد حکومت نے لڑاؤ اور تقسیم کرو، کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے، ہندو مسلم فسادات شروع کرا دیئے، دیکھتے ہی دیکھتے سارا ہندو مسلم اتحاد ختم ہو گیا۔

اُدھر ترکی میں مصطفےٰ کمال نے شجاعت و تدبر سے کام لے کر اہل یونان کو ایشائے کوچک اور تھریس سے نکالا پھر ان کی فوجیں قسطنطنیہ میں بھی داخل ہو گئیں، انگریزوں سے بھی بالآخر ایک معاہدہ ۱۹۲۴ء میں بمقام لوزان ہو گیا، اس کی رو سے ایشائے کوچک اور یورپ کے ایک تھوڑے سے علاقہ میں جس میں قسطنطنیہ اور ایڈریانوپل بھی شامل تھے۔ ترکی کی آزاد حکومت قائم ہو گئی۔ مصطفےٰ کمال نے فتح کے بعد خلافت اسلامیہ ہی کو ختم کر دیا اور ملک میں جمہوری حکومت قائم کر دی۔ ہند کے مسلمانوں خصوصاً تحریک خلافت

کے علمبرداروں کو قدرتاً اس کارروائی سے سخت صدمہ پہونچا۔ تحریک خلافت و ترک موالات کی ناکامی کا اثر یوں تو سارے ملک پر بہت خراب پڑا لیکن مسلمان خصوصیت سے اس سے متاثر ہوئے۔ ان کے باہمی اختلافات اور ترقی کر گئے۔ ۱۹۲۵ء میں شریفی سعودی قضیہ شروع ہوا۔ سلطان ابن سعود والی نجد کی فوجوں نے حجاز پر حملہ کر کے شریف حسین اور اس کے بیٹے امیر علی کو ارض حجاز سے بے دخل کر دیا۔ سلطان کے عقائد کی وجہ سے مسلمانان ہند کا ایک طبقہ اس سے ناراض تھا۔ مزارات و مقدس مقامات کے انہدام کی خبروں نے اس ناراضی کو اور بڑھا دیا۔ دوسری طرف ایک طبقہ جو شریف حسین کی انگریز نوازی کی وجہ سے اُن سے سخت بیزار تھا سلطان ابن سعود کی حمایت کرنے لگا۔ سلطان نے چونکہ ابتدا میں وعدہ کیا تھا کہ وہ حجاز میں اپنی بادشاہت قائم کرنے نہیں، بلکہ اسلامی حکومت قائم کرنے آ رہے ہیں اس لئے مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور دوسرے خلافتی رہنماؤں نے ان کی حمایت کی لیکن سلطان نے بعد میں ملک الحجاز ہونے کا اعلان کر دیا۔ مکہ معظمہ میں مؤتمر عالم اسلامی (مسلمانان عالم کی نمائندہ کانفرنس) منعقد ہوئی، لیکن سلطان کے اعلان ملوکیت کے باعث اس کا انعقاد خلافت اسلامیہ کے احیاء کا باعث نہ بن سکا۔

۱۹۲۸ء میں ہند کے پڑوسی ملک افغانستان میں بھی انقلاب بپا ہوا جس سے ہندوستان کے مسلمان بھی خاصے متاثر ہوئے۔ شاہ امان اللہ خاں نے مغربی طرز کی جو اصلاحات سفر یورپ سے واپسی کے بعد اپنے ملک میں رائج

کی تھیں اُن سے افغانستان میں سخت بے چینی پھیلی اور اس بے چینی نے پھر بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ بچہ سقہ اس باغی جماعت کا لیڈر تھا۔ شاہ امان اللہ تخت چھوڑ کر چلے آئے۔ اور کچھ عرصہ وہاں "سقہ شاہی" قائم رہی۔ بالآخر نادر شاہ غازی، جو پہلے جنرل نادر خاں کے نام سے مشہور تھے، یورپ سے افغانستان آئے اور بچہ سقہ اور اسکے حامیوں کو شکست دے کر تخت افغانستان پر متمکن ہوئے نادر شاہ کے جذبۂ اسلامیت کے باعث علامہ اقبال اُن سے بہت متاثر تھے۔ ان کی طلبی پر وہ افغانستان بھی گئے۔ انھیں شاہ غازی سے بڑی اُمیدیں تھیں لیکن افسوس کہ ان امیدوں کی تکمیل سے قبل، شاہ غازی، ایک ناعاقبت افغانی کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔

ایران میں رضا شاہ پہلوی نے اپنے حسن تدبر سے انگریزی اور روسی ارباب سیاست کو نیچا دکھانے میں اور اپنے ملک کو ترقی کی راہ پر چلانے میں جو کامیابی حاصل کی۔ اس نے بھی اقبال کو متاثر کیا۔ ہاں البتہ شاہ پہلوی کے تجدد سے وہ خوش نہ تھے۔ اس طرح مصر کے جوان عمر تاجدار شاہ فاروق سے بھی انھوں نے اپنے آخر زمانہ میں بہت توقعات قائم کی تھیں۔ ارمغان حجاز کے متعدد فارسی قطعات میں اس جواں عمر تاجدار سے کئی جگہ خطاب کیا گیا ہے۔

ادھر ہندوستان میں برابر ہندو مسلم اختلافات بڑھتے گئے۔ سائمن کمیشن کی آمد کے سلسلہ میں نہرو رپورٹ اور آل پارٹیز کانفرنس نے اس خلیج اختلاف کو اور وسیع کر دیا۔ اسکے بعد ہندوستان کے مستقبل کے فیصلہ کے لئے لندن میں گول میز (راؤنڈ ٹیبل) کانفرنس کے سلسلہ کا آغاز ۱۹۳۰ء میں ہوا۔

دوسری گول میز کانفرنس میں علامہ اقبال نے بھی مسلمانوں کے نمایندہ کی حیثیت سے شرکت کی۔ کانفرنس میں شرکت کے بعد آپ اٹلی بھی تشریف لے گئے اور وہاں کے ڈکٹیٹر مسولینی سے جس کی قوت اس وقت انتہائی عروج پر تھی ملے۔ اس کی شخصیت اور کارناموں سے متاثر ہوئے اور اس تاثر کا اظہار آپ کے کلام میں بھی ملتا ہے، لیکن جب ۱۹۳۵ء میں اطالوی فوجوں نے کمزور اور بے یارومددگار ملک حبش پر چڑھائی کی تو اقبال نے اس پر سخت نکتہ چینی کی۔

اس زمانہ میں آل انڈیا مسلم لیگ اختلافات کا شکار تھی، اس لئے سر آغا خان نے ایک نئی سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم کانفرنس کے نام سے قائم کی۔ چند سال اس کا بڑا غلغلہ رہا۔ علامہ اقبال اسمیں بھی شریک رہے۔ لیکن ۱۹۳۶ء سے آل انڈیا مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی سیاست کا مرجع و مرکز بن گئی، اس نے اقبال کے نظریہ پاکستان کو اپنا کر مسٹر محمد علی جناح کی قیادت میں ایک نئی زندگی اپنے ۱۹۳۷ء کے اجلاس منعقدہ لکھنؤ سے حاصل کر لی۔ اور نیشنلسٹ مسلمانوں، جمعیۃ العلماء، صوبہ سرحد کے سرخ پوشوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کی اکثریت، رفتہ رفتہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئی۔ لیکن ابھی مسلم لیگ اپنے انتہائے عروج کو نہیں پہونچنے پائی تھی کہ اپریل ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبال ہی اس جہان فانی سے دار البقا کی طرف کوچ کر گئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

اقبال کی شاعری بحیثیت شاعر کے

اقبال کی شاعری کا آغاز ان کی طالب علمی ہی کے زمانہ سے ہو گیا تھا۔ ان کے خاص رفیق سر شیخ عبدالقادر صاحب کے بیان کے مطابق وہ

"ابھی اسکول ہی میں پڑھتے تھے کہ کلام موزوں زبان سے نکلنے لگا"

آپ کے وطن سیالکوٹ میں اس زمانہ میں ایک چھوٹا سا مشاعرہ ہوتا تھا اسکے لئے وہ بھی کبھی کبھی غزل لکھا کرتے تھے۔ ۱۸۹۵ء میں جب اقبال کالج کی اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور آئے تو ان کی شاعری کی نشو و نما کے لئے اور اچھی اور وسیع فضا ملی۔ وہاں کے بڑے مشاعرے میں جو مرزا ارشد گورگانی دہلوی وغیرہ کی سرپرستی میں ہوتا تھا، وہ کلام پڑھنے لگے۔ آپ نے مرزا ارشد سے بھی اپنی غزلوں کی اصلاح لی۔ پھر استاد سخن داغ دہلوی سے بعض غزلوں پر تحریری اصلاح حاصل کی۔ اس ابتدائی دور میں اقبال نے ایک مشاعرہ میں جس کی صدارت مرزا ارشد گورگانی کر رہے تھے ایک غزل پڑھی جب وہ اس شعر پر پہونچے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو مرزا صاحب پھڑک اُٹھے اور یہ پیشین گوئی کی کہ اس نوجوان شاعر کا مستقبل نہایت درخشاں ہوگا۔ اور اسی وقت بعض ناقدین سخن نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ "اقبال غالب کے بعد اردو کا سب سے بڑا شاعر ہے"۔

ان کے ابتدائی دور میں لاہور میں ایک ادبی مجلس کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے ایک جلسہ میں انھوں نے اپنی مشہور نظم "کوہ ہمالہ" سنائی جس میں فارسی بندشوں۔ انگریزی خیالات کے ساتھ ساتھ قوم پرورانہ جذبات کو نہایت خوش اسلوبی سے سمویا گیا تھا۔ یہ نظم بہت مقبول ہوئی۔ سر عبدالقادر مرحوم نے اپنے مشہور ادبی رسالہ "مخزن لاہور" کے پہلے نمبر میں جو اپریل ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا تھا، یہ نظم شائع کی۔ اس سے اس نظم کی شہرت اور پھیل گئی۔ اس نظم کے چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں ؎

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

برف نے باندھی ہے دستار فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہ مہر عالمتاب پر

چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرم سخن
تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن

اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے
دست قدرت نے بنایا ہے عناصر کیلئے

ہائے کیا فرط طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیل بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

بالکل ابتدائی دور چھوڑ کر اگر اقبال کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ "نہ تو فارسی میں ان کے رنگ کا کوئی شاعر پایا جاتا ہے اور نہ اردو میں اس سے قبل کوئی اس انداز کا شاعر گذرا ہے"۔ انھوں نے اپنی قومی نظموں میں ایک حد تک حالی اور بچوں کی نظموں میں مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کا اتباع کیا ہے۔ لیکن ان نظموں میں بھی وہ نہ صرف خیالات کے اعتبار سے بلکہ طرز ادا کے لحاظ سے اپنا ایک مخصوص رنگ رکھتے ہیں۔ اس طرح ان کا ظریفانہ کلام جو بہت مختصر ہے، اکبر الہ آبادی کے رنگ میں ہونے کے باوجود اقبالیت کی غمازی کر رہا ہے۔

ان کے دورِ اول کا کلام (۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۵ء) بڑی حد تک غزلوں پر مشتمل ہے اس دور کی متعدد غزلوں میں داغ کا رنگ نمایاں ہے، مثلاً وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے ؎

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

خود اقبال نے بھی اپنی ایک پرانی غزل میں داغ کے تلمذ پر فخر کیا ہے ؎

نسیمؔ و تشنہؔ ہی اقبالؔ کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِؔ سخن داں کا

بعض ملی و قومی نظموں میں بھی داغ اور ان کے معاصر امیر مینائی کے رنگ کی جھلک ملتی ہے مثلاً ان کی مشہور نظم "فریادِ امت" کے اشعار میں ؎

ضبط کی جا کے سنا اور کسی کو ناصح
اشک بڑھ بڑھ کے یہ کہتا ہے کہ طوفاں ہو ہمیں

حسن کا گنجِ گرانمایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

دمِ خنجر میں دمِ ذبح سما جاتا ہوں
جوہرِ آئینۂ خنجرِ قاتل ہو کر

عشق کا تیر قیامت تھا الٰہی توبہ
دل تڑپتا ہے مرا طائرِ بسمل ہو کر

لیکن چونکہ وہ طبعاً فلسفی تھے اور ایک مستقل پیام کے حامل قومی و ملی شاعر تھے اس لئے جلد ہی انھوں نے یہ رنگ ترک کر دیا اور اس دور کی اکثر غزلوں کو انھوں نے اپنے پہلے دیوان بانگ درا کی اشاعت کے وقت چھانٹ دیا۔

بچوں کے لئے انھوں نے اس ابتدائی دور میں جو نظمیں لکھیں اُن میں

سے اکثر مختلف یوروپین شعرار کے کلام سے ماخوذ ہیں۔ جس کی تصریح خود بانگ درا میں کر دی گئی ہے مثلاً ایک کرڈی اور مکھی، بچے کی دعا، ماں کا خواب یا پیام صبح، رخصت اے بزم جہاں وغیرہ اس دور کی بعض اور نظمیں بھی مشہور مغربی شعرا مثلاً گوئٹے، ایمرسن اور ٹینی سن سے ماخوذ ہیں جو اقبال کی موضوعی نظموں کا نقش اولیں کہی جا سکتی ہیں۔ ان نظموں میں فلسفیانہ خیالات ہیں، لیکن اقبال کا کمال یہ ہے کہ یہ نظمیں اردو کا جامہ پہننے کے بعد اس کا ایک جزو معلوم ہوتی ہیں۔ مغربی شاعری کے دوسرے مقلدوں کے کلام کی طرح اردو شاعری کے لئے بے جوڑ نظر نہیں آتیں۔

ان کی سیاسی یا وطنی شاعری بھی اعلیٰ سیاسی خیالات کے ساتھ ساتھ ادبی چاشنی بھی رکھتی ہے۔ نظموں میں روانی غضب کی ہے۔ ان نظموں میں ترانۂ ہندی، نیا شوالہ اور صدائے درد، خاص طور سے قابل ذکر ہیں ترانۂ ہندی، سلیس و آسان اردو کا بہترین نمونہ ہے۔ ہر شخص اسے سمجھ سکتا اور اس سے متاثر ہو سکتا ہے۔ خود گاندھی جی کو بھی یہ ترانہ بہت پسند تھا۔ اور ایک عرصہ تک آل انڈیا کانگریس کے اجلاسوں اور دوسرے قومی جلسوں میں بھی پڑھا جاتا تھا۔

اس ابتدائی دور کا کلام سراپا آمد معلوم ہوتا ہے، آورد کا اس میں نام و نشان نہیں۔ سر شیخ عبد القادر بھی اس دور کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:-

"شیخ صاحب (اقبال) اس وقت طالب علمی سے فارغ ہو کر

گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہو گئے تھے اور دن رات علمی صحبتوں اور مشاغل میں بسر کرتے تھے طبیعت زوروں پر تھی۔ شعر کہنے کی طرف جس وقت مائل ہوتے تو غضب کی آمد ہوتی تھی۔....

میں نے اس زمانہ میں انہیں کبھی کاغذ قلم لے کر فکرِ سخن کرتے نہیں دیکھا۔ موزوں الفاظ کا ایک دریا بہتا یا چشمہ ابلتا معلوم ہوتا ہے۔"

سفرِ یورپ نے ان میں اور اُن کے ساتھ ان کی شاعری میں بہت کچھ تغیر کر دیا کہ وہ شاعر کے بجائے ایک پیامبر بن گئے۔ کلام میں معنویت پہلے سے بڑھ گئی اور اس پیام میں اسلامیت اور ملیت قدرتاً نمایاں اور بہت نمایاں تھی۔ مثلاً علی گڑھ کالج (جو بعد میں مسلم یونیورسٹی بنا) کے طلبہ کے نام پیام میں وہ کہتے ہیں ؎

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

طائرِ زیرِ دام کے نالے تو سن چکے ہو تم
یہ بھی سنو کہ نالۂ طائرِ بام اور ہے

جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

شمعِ سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز
غمکدۂ نمود میں شرطِ دوام اور ہے

لیکن اس دور کا کلام بھی روانی اور جوش کے اعتبار سے کچھ کم نہیں۔ جدتِ تراکیب اور خوبیٔ تشبیہ کے محاسن پہلے سے بھی کچھ زیادہ نظر آتے ہیں۔

ان شاعری کا تیسرا دور جس میں وہ اردو کے بجائے فارسی کو اپنا ذریعہ اظہارِ خیالات بنا رہے تھے۔ شروع کے دو دوروں سے ممتاز حیثیت

رکھتا ہے۔ شیخ عبدالقادر، مقدمۂ بانگ درا میں لکھتے ہیں :۔

"فارسی گوئی کا ایک اثر اقبال کے اردو کلام پر یہ ہوا ہے کہ جو نظمیں اُردو میں دورسوم میں لکھی گئی ہیں ان میں اکثر فارسی ترکیبیں اور فارسی بندشیں پہلے سے بھی زیادہ ہیں اور بعض جگہ فارسی اشعار پر تضمین کی گئی ہے۔"

اس زمانہ کی پُرجوش اور انتہائی مقبول نظموں میں شکوہ، جواب شکوہ، شمع و شاعر وغیرہ ہیں۔ اس دور کی آخری معرکۃ الآرا نظم طلوع اسلام ہے۔ یہ اس زمانہ میں لکھی گئی جبکہ ترکی فوجوں نے مصطفٰے کمال کی قیادت میں اوّل یونانی فوجوں کو ایشیائے کوچک اور تھریس (یورپین ترکی) سے نکال دیا پھر برطانوی فوجوں کو بھی قسطنطنیہ (استانبول) کے خالی کرنے پر مجبور کیا۔ قدرتاً یہ نظم بھی جوش کے ساتھ مستقبل کے بارہ میں نہایت اُمید افزا خیالات پر مشتمل ہے ؎

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہونگے پھر گہر پیدا

ان کی شاعری کا تیسرا دور اس "طلوع اسلام" پر ختم ہوا اور اس کے بعد کئی سال تک انھوں نے اردو کو بالکل نہیں چھوا اور تمام فارسی میں کہتے رہے۔

چوتھے دور کا کلام بالِ جبریل کے نام سے شائع ہوا۔ اس کی خصوصیت

یہ تھی کہ وہ فلسفۂ خودی کے نشہ میں سرشار و بیخود نظر آتے ہیں۔ مثلاً ؎

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبِ جو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

اس مجموعۂ کلام کی نظموں میں شاعرانہ جوش و خروش کے لحاظ سے ساقی نامہ سیاسی رنگ میں ہونے کے باوجود بے مثل ہے۔ میر حسن دہلوی کی مثنوی سحرالبیان کی بحر میں ہے اس لئے اس کی روانی اور بڑھ گئی ہے اردو ادب میں یہ ساقی نامہ یادگار رہے گا۔ اسکے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پُرجوش الفاظ اور مست خیالات کا سمندر اُمنڈتا چلا آرہا ہے ؎

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
ارم بن گیا دامنِ کوہسار

گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

فضا نیلی نیلی ہوا میں سُرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

اور یہ اشعار تو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ؎

ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ

پُرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

آگے چل کر اپنے مخصوص فلسفۂ خودی کو اپنے رنگ میں پیش کیا ہے

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک — من و تو میں پیدا، من و تو سے پاک
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں — پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں
اسے واسطہ کیا کم و بیش سے — نشیب و فراز و پس و پیش سے

بالِ جبریل کا حصہ غزلیات، جوشِ بیان، ندرت، تشبیہات، مضمون آفرینی کے اعتبار سے کسی طرح بانگِ درا سے پست اور فروتر نہیں کہا جا سکتا۔ اقبال کی حیثیت اب بین الاقوامی شاعر کی ہو چکی ہے۔ ملک اور وطن کے جغرافی قیود سے ان کی نگاہ بلند ہو چکی ہے اور وہ سارے عالمِ انسانیت کے سامنے ایک مستقل پیام، شاعرانہ حسن و لطافت کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ غزلوں سے چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر — ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر
تو ہے محیطِ بیکراں، میں ہوں ذرا سی آبجو — یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر
روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل — آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

میری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو — کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنابندی

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام — اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں
کہہ گئیں رازِ محبت پردہ داری ہائے شوق — تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں — یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

بال جبریل کی نظموں میں ساقی نامہ اور اس کی روانی کا ذکر اوپر آچکا مجموعہ کی دوسری مشہور نظمیں حسب ذیل ہیں:۔ مسجد قرطبہ۔ لینن خدا کے حضور میں۔ فرمان خدا۔ ذوق و شوق۔ جبریل و ابلیس۔ فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں۔

فرمان خدا کے یہ اشعار تو بے خدا اشتراکیوں کی بھی زبان پر بے ساختہ آجاتے ہیں ؎

گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے — کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

لینن والی نظم میں مغربی تہذیب و تمدن کے مصائب و نقائص لینن کی زبان سے نہایت خوبی کے ساتھ ادا کرائے ہیں۔ اس موضوع پر اردو میں ایسی کوئی اور نظم نہیں مل سکتی ؎

رعنائی تعمیر میں رونق میں صفا میں — گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت — پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت

ضربِ کلیم

بال جبریل کے بعد اقبال کا ایک اور مجموعہ کلام ۱۹۳۶ء میں ضرب کلیم کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں وہ شاعر سے زیادہ حکیم و واعظ نظر آتے ہیں خیالات کی پختگی، پیام میں گہرائی اور گیرائی پہلے سے زیادہ نظر آتی ہے۔ اور بعض نظمیں اپنی روانی اور برجستگی کے لحاظ سے بھی پچھلے مجموعہ کلام کی رواں نظموں سے کم نہیں لا الٰہ الا اللہ کے زیر عنوان کلمۂ توحید کے اس جزو اول کی تفسیر و تعبیر ایک نرالے انداز میں کی ہے ؎

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

خودی ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زمان و مکاں لا الٰہ الا اللہ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

معراج نبوی کے سلسلہ میں یہ نکتہ آفرینی، اقبال کا سا عارف حقیقت و محرم اسرار ہی کر سکتا ہے ؎

دے ولولۂ شوق جسے لذت پرواز
کر سکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو تاراج

ناوک ہے مسلمان ہدف اس کا ثریا
ہے سرِ سراپردۂ جاں نکتۂ معراج

"مرد مسلمان" کے عنوان سے اس مجموعہ میں اقبال کی نظم بہت ہی خاص ہے ؎

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

ہمائے جبرئیل امیں بندۂ خاکی — ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآں

زمانۂ حاضر کے انسان کی جو سائنس کے انکشافات میں الجھا ہوا، عاقبت و معاد سے بے خبر ہے کتنی صحیح عکاسی اقبال نے کی ہے ۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

شعاع امید کے نام سے اس مجموعہ میں جو نظم ہے وہ اس الزام کی پوری تردید کرتی ہے کہ اقبال آخر میں صرف ایک فرقہ کے شاعر ہو کر رہ گئے تھے اور اپنے ملک (ہندوستان) کی محبت ان کے دل میں بالکل نہ رہ گئی تھی ۔

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو — جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز — اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں — محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بتخانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن — تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہ محراب

اس مجموعہ کی سب سے اہم نظم "محراب گل افغان کے افکار" ہے جس میں اقبال نے افغانستان کے فرزندان کوہستان کو اپنا مخاطب خصوصی بنایا ہے۔

ارمغان حجاز

اقبال کا آخری مجموعہ کلام ارمغان حجاز کے نام سے اواخر ۱۹۳۸ء میں

یعنی ان کی وفات کے بعد شائع ہوا اس کا بڑا حصہ فارسی پر مشتمل ہے آخر میں تھوڑا حصہ اردو کا بھی ہے۔ اس حصہ کی تمام نظمیں نہایت بلند، پرجوش، ولولہ انگیز ہیں۔ بقول ایک نقاد کے "کہ چراغ جب بجھنے لگتا ہے تو اس کی لو اور زیادہ تیز ہو جاتی ہے"...... ڈاکٹر صاحب کی ان نظموں کا یہی حال ہے۔ اس حصہ کی سب سے معرکۃ الآرا نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ ہے "بڈھے بلوچ کی نصیحت اپنے بیٹے کو" بھی بہت خوب ہے خصوصاً اس کا یہ شعر ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

بانگ درا میں اقبال نے متعدد مرثیے لکھے ہیں جن میں داغ دہلوی اور اپنی والدہ مرحومہ کے مرثیے خاص طور سے مشہور ہیں۔ اس آخری مجموعہ کلام میں اپنے ایک مخلص رفیق سر راس مسعود ملقب بہ مسعود یار جنگ سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا مرثیہ خون جگر سے لکھا ہے ؎

یہ مہر و ماہ یہ ستارے یہ آسمان کبود — کسے خبر کہ یہ عالم عدم ہے یا کہ وجود
رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی — وہ یادگار کمالات احمد و محمود
زوال علم و ہنر مرگ ناگہاں اس کی — وہ کارواں کا متاع گراں بہا مسعود
مجھے رلاتی ہے اہل جہاں کی بے دردی — فغان مرغ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود

آگے چل کر اپنے مخصوص موضوع خودی پر آ گئے ہیں ؎

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقام حیات — کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحان ثبات
خودی ہے زندہ تو دریا ہے بے کرانہ ترا — ترے فراق میں مضطرب ہے موج نیل و فرات

حریمِ ذات ہے اس کا نشیمن ابدی | نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات
خودآگہاں کہ ازیں خاکداں برون جستند | طلسمِ مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

اس مرثیہ میں وہی بلند آہنگی موجود ہے جو ان کی دوسری ولولہ انگیز نظموں میں ملتی ہے اور خودی کی تعریف و منقبت نے تو مرثیہ کی صنعت میں ایک انقلاب بپا کر دیا ہے۔

اقبال کا فلسفہ

اقبال کا فلسفۂ جدید کے ماہر کی حیثیت رکھتے تھے، ساتھ ہی قدماء کے فلسفہ پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ لیکن فلسفہ کی یبوست اور بے نیازی اُن کی شاعری کی رنگینی پر کبھی غالب نہیں آئی۔ ساتھ ہی ان کی فلسفیت نے انھیں کبھی شاعرانہ تخئیل کے سیل رواں میں بہنے نہ دیا، وہ عام فلسفیانہ رجحان رکھنے والوں کی طرح کبھی فلسفہ کی الجھنوں میں گرفتار نہیں ہوئے بلکہ دوسروں کو بھی فلسفہ کے مطالعہ میں اعتدال کی تلقین کرتے رہے اور اُن گمراہیوں سے بچنے کی نصیحت کرتے رہے جو فلسفیت میں غلو سے پیدا ہو جاتی ہیں۔

ضربِ کلیم میں انھوں نے ایک فلسفہ زدہ سیّد زادہ کو اس موضوع پر بڑی بیش بہا نصیحتیں کی ہیں ؎

تو اپنی خودی میں اگر نہ کھوتا | زناری برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی | ہے اس کا طلسم سب خیالی

انجام خرد ہے بے حضوری ہے فلسفۂ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت ہیں ذوق عمل کے واسطے موت

ان کی ایک اور نظم میں فلسفہ کے متعلق ان کا اختیار کردہ صحیح جادۂ اعتدال اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔

جس معنیٔ پیچیدہ کی تصدیق کرے دل قیمت میں بہت بڑھ کے ہے تابندہ گہر سے
یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

یوں تو ڈاکٹر صاحب کے مجموعۂ کلام میں ہر قسم کے قدیم و جدید فلسفیانہ خیال کثرت سے ملتے ہیں، لیکن ان کے کلام کو شہرت کے بام رفیع تک پہنچانے اور انھیں بین الاقوامی شاعر کی حیثیت دینے میں سب سے زیادہ ان کے فلسفۂ خودی نے حصہ لیا ہے۔ اس "خودی" کے لفظ سے دھوکا نہ کھانا چاہیے اس سے فخر، غرور یا گھمنڈ ہرگز مراد نہیں بلکہ وہ استقلال ذاتی مراد ہے جو ہر مخلوق کے علم و عمل کو ایک مخصوص دائرہ میں نمایاں کرتا ہے، اور اس کی ترقی د بالیدگی کے سامان فراہم کرتا ہے اس لیے وہ جوہر ہے عرض نہیں، متحرک ہے ساکن نہیں۔ اس سے مراد حقیقی زندگی ہے اور زندگی کی تمام لذتیں اس کے استحکام، اثبات اور تقویت سے وابستہ ہیں۔ قدیم صوفیوں کے ایک گروہ نے اس خودی کو وحدت الوجود وغیرہ کے عقائد کی تلقین کے ذریعہ فنا کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ مسیحی راہبوں نے بھی یہی طریقہ خودی کو فنا کرنے کا اختیار کیا تھا۔ اقبال نے ان خودی مٹانے والے نظریات کے خلاف خاص طور سے آواز اٹھائی۔ خودی کے اس دقیق فلسفہ کو انھوں نے

اور اپنی مشہور زمانہ فارسی مثنوی اسرار خودی کے ذریعہ شاعرانہ رنگ میں ظاہر کیا، اسی مثنوی کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں کہ

"فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس حقیقت کے سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی ہو"

خودی کا یہ فلسفہ تنہا اسرار خودی ہی میں نہیں بلکہ ان کے کلام کے اور حصوں میں بھی کثرت سے ملتا ہے اس فلسفہ کے خاص خاص اجزا حسب ذیل ہیں :-

(۱) انسان کی خودی ایک مستقل اور بدیہی چیز ہے، خود انسان کے اندر سے یہ آواز آتی ہے کہ میں ہوں، یہ خودی بذات خود پیدا نہیں ہوئی بلکہ اس کا کوئی پیدا کرنے والا بھی ہے، خدا کی ذات بے نہایت کے لئے انھوں نے دریا کا لفظ استعمال کیا ہے اور خودی انسانی کو اس دریا کا ایک قطرہ قرار دیا ہے۔ یہ قطرہ اس دریا کے سامنے نہایت حقیر و کمترین ہونے کے باوجود اقبال کے نزدیک مستقل وجود اور کم تابندہ کی حیثیت رکھتا ہے، وہ انسانی خودی کو ذات خداوندی سے بالکل الگ اور مستقل چیز ہے، اس انفرادی استقلال کے ساتھ قایم رکھنا چاہتے ہیں اور صوفیوں کے اس خیال کی سخت مخالفت کرتے ہیں کہ اس خودی انسانی کو ذات خداوندی میں جذب و ضم ہوجانا چاہیئے۔

(۲) خودی انسانی نہ صرف ایک مستقل چیز ہے بلکہ وہ انسانیت کی وجہ

سے ایک مخصوص شرف و فضیلت رکھتی ہے۔ انھوں نے انسان کو اسی خودی کے باعث ساری کائنات سے افضل و اشرف ٹھہرایا ہے ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

عالم آب و خاک و باد سِرّ عیاں ہے تو کہ میں
وہ جو نظر سے ہے نہاں، اس کا جہاں ہے تو کہ میں

تو کفِ خاک و بے بصر، میں کفِ خاک و خود نگر
کِشتِ وجود کے لیے آبِ رواں ہے تو کہ میں

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

(۲) انسان کی خودی میں زبردست قوت جاذبہ موجود ہے، اور چونکہ وہ کائنات کی بلند ترین ہستی ہے اس لئے وہ صرف گرد و پیش کی چیزوں ہی کو نہیں بلکہ ساری دنیا کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتی ہے۔ تسخیرِ فطرت اس کا خاصۂ امتیازی ہے ؎

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی

زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آب جو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

طلسم گنبد گردوں کو توڑ سکتے ہیں
زجاج کی یہ عمارت ہے، سنگ خارہ نہیں

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

جس بندۂ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار
شمشیر کے مانند ہے بُرّندہ و براق

اس مردِ خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو   تو بندۂ آفاق ہے، وہ صاحبِ آفاق

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں   یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں

یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر، یہ ہوائیں   تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں   آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں   جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

(۴) دنیا خیر و شر، نیکی و بدی کی معرکہ گاہ ہے اس کے متعلق قدیم و جدید حکماء نے کثرت سے نظریے جن میں بعض ایک دوسرے کے متضاد ہیں، پیش کئے ہیں۔ اقبال نے خودی کو معیارِ شر و خیر ٹھہرایا ہے جو چیزیں تسخیرِ فطرت میں خودی کی معاون و مددگار ہوتی ہیں انہیں خیر اور جو چیزیں مزاحم ہوتی ہیں ان کو شر قرار دیا ہے۔

نمود جس کی فرازِ خودی سے ہو وہ جمیل

جو ہو نشیب میں پیدا، قبیح و نامحبوب

دنیا میں رہ کر شر کا مردانہ وار مقابلہ کرنا خودی کا جوہر ہے۔ عیسائی راہبوں اور تارکِ دنیا صوفیوں کی طرح اس میدان سے پاؤں ہٹا لینے کے قائل اقبال بالکل نہیں۔ بلکہ وہ اسے بزدلانہ فرار اور شکست سمجھتے ہیں۔

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں   بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست

فقیہِ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور   کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست

گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

جو سختئ منزل کو سامان سفر سمجھے — اے وائے تن آسانی ناپید ہے وہ راہی

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں — اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری — کمال ترک ہے تسخیر خاکی و نوری

(۵) اس دنیا کو ڈاکٹر صاحب خیر و شر کی رزمگاہ تسلیم کرتے ہیں اور انکے فلسفۂ خودی کے مطابق اس رزمگاہ میں مردانہ وار مقابلہ کرنا ہی عین زندگی ہے اور اس جنگ کے لئے جسمانی قوت اور روحانی قوت دونوں کا ہونا ضروری ہے اور ان کے نزدیک اس جسمانی قوت سے روحانی قوت بھی حاصل ہو سکتی ہے وہ تن اور جان، جسم و روح میں مغائرت و جدائی کے نہیں، اتحاد و یکتائی کے قائل ہیں ؎

تن و جان را دو تا گفتن کلام است
تن و جان را دو تا دیدن حرام است

(۶) اس فلسفۂ خودی کے سلسلہ میں قدرتاً جبر و اختیار کا اہم اختلافی مسئلہ بھی سامنے آتا ہے۔ اقبال نے اس مسئلہ پر یوں نظر ڈالی ہے کہ انسان کو دو نسبتیں حاصل ہیں ایک نسبت تو اس کو خدا کے ساتھ ہے اور اس حیثیت سے وہ خدا کے مقابلہ میں ایک نہایت ہیچ، عاجز اور مجبور ہستی ہے ؎

من ہماں مشت غبارم کہ بجائے نرسد
لالہ از تست و نم ابر بہاری از تست

لیکن دوسری نسبت انسان کو ساری کائنات کے ساتھ ہے، اس حیثیت سے

وہ ساری کائنات کے مقابل میں بالکل آزاد و خود مختار نظر آتا ہے، آفتاب، ماہتاب اور ستارے سبھی خاص قانونِ قدرت کے پابند و محکوم ہیں، اور اپنے محدود دائرہ سے آگے پیچھے بالکل نہیں جا سکتے لیکن ان کے مقابلہ میں انسان کی قدرت، اختیار، ایجاد و اختراع کی کوئی حد ہی نہیں، مختصر یہ کہ انہوں نے انسان کو نہ تو مجبورِ مطلق مانا ہے نہ مختارِ مطلق بلکہ ان دونوں کے بین بین ایک متحرک زندہ طاقت کی حیثیت دی ہے جو اپنے افعال و اعمال میں آزاد اور ان کے لئے ذمہ دار و جوابدہ ہے اور یہی آزادیٔ عمل اس کی خودی کی نشو و نما کرتی ہے ؎

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی — ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد
ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے — وہ عالم مجبور ہے تو عالم آزاد

وجود ضمیری کائنات ہے اس کا — اسے خبر ہے یہ باقی ہے اور وہ فانی

(۳) اسی خودی کے اثبات و استحکام کے لئے اقبال نے جدید تمدن و تہذیب کے مضر اثرات سے محفوظ رکھنے کی غرض سے صحرائیت اور بدویت کی زندگی کی تلقین کی ہے۔ اس سے وحشیانہ زندگی ہرگز مقصود نہیں بلکہ صرف یہ مقصود ہے کہ انسان جدید تمدن و تہذیب کی ہنگامہ آرائیوں سے الگ رہ کر اپنی خودی کی تربیت کر سکے۔ فرانس کے مشہور فلسفی روسو نے بھی جدید تہذیب و تمدن کی سخت مخالفت کی ہے اور انسان کی ابتدائی فطری حالت کو بہتر قرار دیا ہے۔ اس بارہ میں اقبال بھی ایک حد تک روسو کے خیالات سے متاثر ہوئے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اقبال نے مسلمان ہونے

ہونے کی حیثیت سے "دشتِ حجاز" کا نام کثرت سے لیا ہے اور مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ چونکہ ان کا اصل مولد و منشا صحرائے عرب ہے اس لئے انہیں قدرتاً اسی صحرائے عرب کی طرف رُخ کرنا چاہیئے ؎

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی — یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی
اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن — بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی

ہوتا ہے کوہ و دشت میں پیدا کبھی کبھی — وہ مرد جس کا فقر خزف کو کرے نگیں
خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف — کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز
یہی ہے سرِ کلیمی ہر اک زمانے میں — ہوائے دشت و شعیب و شبانیٔ شب و روز

(۹) اقبال کے فلسفۂ خودی میں عقل و عشق کو خاص اہمیت ہے اور یہ دونوں ان کے نزدیک خودی کے اجزائے ترکیبی ہیں ؎

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل

انہوں نے اس عقل کی سخت مخالفت کی ہے جو عشق سے بالکل علیحدگی اختیار کرے۔ مولانا رومؒ کے دور میں بھی عشق و عقل کا پرزور مقابلہ تھا اور ان کی مثنوی میں ان دونوں کا ذکر خاص طور سے ملتا ہے۔ لیکن ان کے زمانہ میں عقل و عشق دونوں زندہ تھے اور عشق عقل کا مقابلہ ڈٹ کر کر سکتا تھا۔
اقبال کے دور میں عشق پر مردنی چھا گئی تھی اور صرف عقل زندہ سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے اقبال نے عشق کے مقابلہ میں عقل کو شکست دیکر وہی کام کیا ہے جو پرانے مثنوی کے دور میں مولانا رومؒ نے انجام دیا تھا۔

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے   عشق بیچارہ نہ ملا، نہ زاہد، نہ حکیم

حد ادراک سے باہر ہیں باتیں عشق و مستی کی

سمجھ میں اس قدر آیا کہ دل کی موت ہے دوری

مولانا روم نے اپنے زمانہ کے ماہر عقلیات امام رازی کی تعلیمات کے سلسلہ میں کہا تھا ؎

گر باستدلال کار دیں بدے   فخر رازی راز دار دیں بدے

اقبال نے یہ بات یوں ادا کی ہے ؎

علاج ضعف یقین ان سے ہو نہیں سکتا

غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

اور اس شعر کے ذریعہ تو انھوں نے عقل پر عشق کو فتح دلوا کر اسے ضرب المثل کی سی حیثیت دلوا دی ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق   عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

علامہ اقبال نے پہلی بار اپنا یہ فلسفہ خودی، فارسی مثنوی اسرار خودی کے ذریعہ پیش کیا۔ اس کے متعلق بعض انگریز تبصرہ نگاروں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ یہ جرمن فلاسفر نٹشے کے خیالات کا چربہ ہے۔ لیکن خود علامہ نے اس خیال کی تردید کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ

"بعض انگریز تنقید نگاروں نے اس سطحی تشابہ و تماثل سے جو میرے اور نٹشے کے خیالات میں پایا جاتا ہے، دھوکا کھایا ہے اور غلط راہ پر پڑ گئے ہیں"..... (تبصرہ نگار) "انسان کامل"

کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکا یہی وجہ ہے کہ اس نے خلاف مبحث کر کے میرے انسان کامل اور جرمن مفکر کے "فوق الانسان" کو ایک ہی چیز فرض کیا ہے۔ میں نے آج سے تقریباً ۲۰ سال قبل انسان کامل کے متصوفانہ عقیدے سے متعلق قلم اٹھایا تھا۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو نٹشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہونچا تھا نہ اس کی کتابیں میری نظروں سے گذری تھیں۔

مکتوب اقبال بنام ڈاکٹر نکلسن مترجم اسرار خودی

لیکن اقبال کے ایک فلسفی دوست ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اس موضوع پر اپنے ایک مفصل مضمون میں اس رائے کو تسلیم نہیں کیا ہے اور اسے بڑی حد تک نٹشے ہی کے فلسفہ اور فلسفہ حیات سے ماخوذ بتایا ہے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ نٹشے منکر خدا ہے اور اقبال موحد اور انھوں نے اس کے ساتھ اسلامی چیزیں بھی شامل کر دی ہیں۔ انھوں نے اقبال اور نٹشے میں بعض اور فرق بھی اس سلسلہ میں ظاہر کئے ہیں:-

(۱) نٹشے کے یہاں تخریبی افکار بہ نسبت ترکیبی افکار کے زیادہ ہیں اور اس میں جلال کا پہلو جمال کے پہلو پر غالب ہے۔

(۲) اقبال خودی کے ساتھ ایک بیخودی کا بھی فلسفہ رکھتے ہیں۔

(۳) نٹشے کے یہاں انفرادی خود اختیاری کا غیر معمولی زور ہے اور قاہری غالب ہے اور دلبری مغلوب۔ اقبال کے نصب العین انسانی میں ناز کے ساتھ نیاز بھی ہے۔ ادعا کے ساتھ تسلیم و رضا بھی ہے۔

(۴) نٹشے جمہوریت اور مساوات کا دشمن ہے اور غریبوں اور کمزوروں کے لئے اُسکے پاس نفرت کے احساس کے سوا کچھ نہیں۔ اقبال بھی جمہوریت کی موجودہ شکلوں کو دھوکا سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک اعلیٰ سطح پر صحیح مساوات کے متلاشی ہیں۔

(۵) نٹشے کے یہاں صداقت کا معیار صرف قوت ہے۔ اقبال کے یہاں محض قوت صداقت کا معیار نہیں۔

(۶) اقبال سارے نوعِ انسانی کو اُبھارنا اور ترقی دینے کے خواہاں ہیں۔ نٹشے کی نظر صرف چند کامل افراد تک محدود ہے۔

لیکن اگر نگاہِ حقیقت بین سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اقبال نے نٹشے یا کسی اور قدیم یا جدید فلسفی کے خیالات کو بعینہ نہیں اختیار کیا ہے بلکہ ایک مسلمان کے مذہبی اور اخلاقی بلند مقاصد کے لئے انھیں جس فلسفی یا حکیم کی بات پسند آئی اس کو انھوں نے لے لیا۔ اس سلسلے میں نٹشے کا نمبر اول ہے۔ کیمبرج یونی ورسٹی کے زمانہ طالب علمی میں اقبال نے دو فلسفیوں میک ٹگارٹ اور جیمس وارڈ سے خاص فیض حاصل کیا تھا۔ اور اسی دوران میں اپنے مقالہ ریسرچ کے لئے انھوں نے مولانا جلال الدین رُومی کا بہت ہی عمیق مطالعہ کیا تھا۔ شروع میں وہ میک ٹگارٹ کے اثر سے ایک حد تک عقیدۂ وحدت الوجود کو تسلیم کرتے رہے۔ بعد ازاں اُنھیں جیمس وارڈ کے خدا پرستانہ کثرت وجود اور مولانائے روم کے مابعد الطبیعاتی بیانات میں مشابہت نظر آئی اور اس دور سے وہ

مولانا رومؒ کو اپنا روحانی رہبر ماننے لگے۔ مولانا رومؒ کے یہاں دو جدید فلسفیوں نٹشے اور برگسان کے بعض بنیادی تصورات پہلے ہی سے موجود تھے، اس لئے اقبال ان دونوں فلسفیوں سے بھی خاصے متاثر ہوئے اور ان کے کلام میں اس تاثر کا اظہار جا بجا ملتا ہے۔ مولانا رومؒ کے حصول فیض و استفادہ کا ذکر اقبال کے اردو و فارسی دونوں کلاموں میں ملتا ہے، مثلاً ؎

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

اقبال کے متعلق یہ رائے قائم کرنا ہرگز صحیح نہیں کہ انھوں نے محض دوسرے فلسفیوں کی خوشہ چینی ہی پر اکتفا کی ہے اور اپنا کوئی مستقل فلسفہ نہیں پیش کیا۔ ذرا بھی غور سے دیکھا جائے تو ان کے فلسفۂ خودی کے تمام بنیادی و اساسی مضامین سرچشمۂ ہدایت یعنی قرآن مجید سے ماخوذ ملیں گے مثلاً شرف و فضیلت انسانی، تسخیر فطرت، عزم و ہمت، جرأت و شجاعت، حمیت و غیرت اور قدرت و اختیار پر قرآن مجید میں بکثرت آیتیں موجود ہیں وہ سب اُن کے پیش نظر تھیں اور انھیں کی رہنمائی میں انھوں نے فلسفۂ تصوف پر نظر ڈالی۔ مثنوی مولانا رومؒ میں انھیں ایسے اشعار کثرت سے ملے جو قرآن مجید کی تعلیم کے موافق اور اُن کے فلسفۂ خودی کے موید ہیں۔ اس لئے انھوں نے جس خودی کو فلسفیانہ حیثیت سے پیش کیا وہ نٹشے کی "شیطانی خودی" کے بجائے "یزدانی خودی" کی حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال نے کسی بڑے سے

بڑے مفکر یا فلسفی کی آنکھ بند کرکے تقلید نہیں کی ہے بلکہ ان کے خیالات و افکار میں کثرت سے تصرفات و اضافے کئے ہیں۔ ان کے ایک نقاد نے یہ بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ:۔

"جہاں تک افکار کا تعلق ہے انھوں نے ذرہ ری کا کامل تتبع کیا ہے نہ نٹشے کا نہ برگسان کا۔ اور نہ کارل مارکس کا۔ نہ لینن کا۔ اپنے تصورات کا قالین بنتے وقت انھوں نے رنگین دھاگے اور بعض خاکے اُن لوگوں سے لئے ہیں۔ لیکن ان کے کل قالین کا نقشہ کسی دوسرے کے نقشے کی ہو بہو نقل نہیں ہے۔ اپنی تعمیر کے لئے انھوں نے ان افکار کو سنگ و خشت کی طرح استعمال کیا ہے"

اقبال کا پیام

علامہ اقبال سے قبل اردو شاعری کے ذریعہ کوئی مقصد حیات پیش نہیں ہوا تھا۔ اقبال نے مشرق کی روحانیت اور مغرب کی مادیت دونوں میں اعتدال و توازن قائم کرکے ایک نئی راہ نکالی۔ مشرقیت کے اثر سے شاعری نے زندگی کو سراسر یاس و حرماں قرار دے کر زندگی کے حقائق سے گریز پر زور دے رکھا تھا۔ مغرب نے اس کے برعکس سارا زور مادی زندگی پر دے کر انسان کو عالم آخرت سے یکسر غافل کر دیا تھا۔ اقبال نے نہ تو مشرق کی روحانیت سے انکار کیا نہ مغرب کی مادیت سے، بلکہ دونوں

میں اعتدال اور توازن پیدا کیا۔ ایک طرف اس نے یاس آفریں قدامت میں ضرب لگائی دوسری طرف عہد حاضر کی لذت پرست مادیت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اسلام کی روشنی میں ایک ایسا متوازن نظریۂ حیات پیش کیا جو قدیم اور جدید دونوں کی انتہا پسندی کو ختم کرنے والا ہے۔ ان کی شاعری کا اصل خطاب اگرچہ مسلمانانِ عالم سے ہے لیکن پوری انسانیت اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ انسانیت کی بلندی اور ارتقا ان کی شاعری کا نصب العین ہے۔

انھوں نے فرد اور قوم کے تعلق سے خاص زور دیا ہے۔ فرد کو قطرے سے اور قوم کو دریا سے تشبیہ دے کر انھوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ ایک قوم میں دریا کے مانند وسعت و ہمہ گیری ہونا چاہیے۔ لیکن یہ وسعت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ اس قومیت کی بنیاد ملک، نسب، رنگ و روپ پر نہیں بلکہ روحانی اصول پر جو آفاقی اور عالمی حیثیت رکھتے ہیں، رکھی جائے۔ محدود قومیت جس کی بنیاد ملک، وطن، نسب، رنگ یا زبان پر ہوتی ہے تعصب و تنگ نظری کو پیدا کرتی اور اس وسعت و ہمہ گیری کی قاطع ہے اور دنیا کے لئے باعثِ فلاح نہیں، بلکہ اس کے تنزل و تباہی کا موجب ہے۔ اسی جذبہ کے ماتحت انھوں نے یہ کہا ہے ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اس محدود قومیت و وطنیت کا بحرِ ناپیدا کنار پیدا نہیں ہوتا بلکہ

چھوٹی چھوٹی نہریں پیدا ہوتی ہیں اور فرد و قوم (ملت) کے باہمی امتزاج اور آمیزش سے جو روحانی و اخلاقی فوائد حاصل ہونے چاہئیں وہ حاصل نہیں ہوتے اور رفتہ رفتہ اخوت، محبت و انسانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور قومیت کا ایسا ڈھانچہ باقی رہ جاتا ہے جو روح سے بالکل خالی ہوتا ہے یہ محدود قومیت آدمی کو آدمی سے بیگانہ بناتی ہے۔ اور آدمیت گم ہو کر محض اقوام کا نام باقی رہ جاتا ہے ؎

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند!

اسلام کے عقیدۂ توحید و رسالت کے ذریعہ ہی مسلمانوں میں ان کی وحدت ملی کو برقرار و قائم رکھا جا سکتا ہے، کیونکہ انہیں دونوں اساسی عقائد کی بنا پر ملت اسلامی کسی خاص مقام یا کسی خاص قوم و نسل تک محدود نہیں ؎

قلب ما از ہند و روم و شام نیست
مرز و بوم او بجز اسلام نیست

امتیاز رنگ و نسل کے خلاف انھوں نے ایک جگہ یہ بھی کہا ہے ؎

جو کرے گا امتیاز رنگ و خون مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو، یا اعرابی والا گہر

سرزمین حجاز سے انہیں بے انتہا شغف ہے اور اسے وہ مرکز اسلامی کا درجہ دیتے ہیں۔ بایں ہمہ "ملت گیتی نورد" کو صرف اسی خطہ کے ساتھ مخصوص کرنا نہیں چاہتے، اور کہتے ہیں ؎

تو ابھی رہگذر میں ہے قید مقام سے گذر
مصر و حجاز سے گذر، پارس و شام سے گذر

مذہب کی صحیح تعلیم کے ذریعہ وہ اُن سارے اختلافات کو دور کرنے کی تلقین کرتے ہیں جو قومیت کے محدود نظریہ کی بدولت پیدا ہو گئے ہیں۔ وہ تمام ملتوں کو مٹا کر ایک عالمگیر ملت پیدا کرنا نہیں چاہتے بلکہ مختلف اور باہم متصادم قومیتوں کو مٹا کر ملیت کا ایک ایسا رُوحانی نظریہ قائم کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں ملتیں تو باقی رہ جاتی ہیں، لیکن وہ اختلافات اور تفرقے دور ہو جاتے ہیں۔ جو وطنیت کے محدود نظریہ نے پیدا کر دیئے تھے۔ اقبال کا دعویٰ ہے کہ مذہب و ملت کے روحانی اتحاد سے جو قوم پیدا ہوتی ہے وہ لازوال ہوتی ہے، جس طرح وہ کسی خاص محدود وطن کی پابند نہیں ہوتی اسی طرح اس کا زمانہ بھی غیر محدود ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی قوم ان کے نزدیک اسی قسم کی قوم ہے۔ اس لئے وہ اس کے مستقبل کی طرف سے پُرامید ہیں اور اس کے افراد کے فنا ہونے سے ان کے نزدیک ملت اسلامی پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اس لئے کہ افراد کو مادیت نے اور اس قوم کو روحانیت نے پیدا کیا ہے اور اس کی روحانی زندگی اس کی مذہبی کتاب قرآن سے وابستہ ہے ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

وہ ملت کی زندگی کے لئے افرادِ ملت میں خودی کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ عزم و ہمت اس خودی کے خاص عناصر ہیں، ملت کا خاص کام

جہد حیات و تسخیر فطرت ہے۔ پرانی قوموں کی طرح وہ چاند، سورج آسمان وغیرہ کو دیوتا نہیں قرار دیتے بلکہ وہ ان سب اور ان کے ساتھ ساری کائنات کی تسخیر کو ملی زندگی کی توسیع کا خاص ذریعہ ٹھہراتے ہیں۔ اور ملت اسلامی کو اس تسخیر کی تلقین و ترغیب دلاتے ہیں۔ اس تسخیر کے لئے محض علم ہرگز کافی نہیں بلکہ اسکے لئے عملی طاقت کی بھی ضرورت ہے اور یہ عملی طاقت صرف احکام شریعت کی پیروی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ صوفیوں کے ایک بڑے گروہ نے عجمی خیالات سے متاثر ہو کر اس آئین حیات کو ترک کر کے گوشہ نشینی و عزلت گزینی کی جو تلقین زور شور سے کی تھی اس کا نتیجہ ملت اسلامی کی ذلت و خواری کی شکل میں نکلا۔ اس لئے اقبال نے اس غلط قسم کے اور بے عملی سکھلانے والے تصوف کے خلاف بھی پوری قوت سے آواز اٹھائی اور ملت اسلامی کو اپنے اندر قوت و توانائی پیدا کرنے اور اپنی سیرت کو پختہ و محکم بنانے کا پیام خاص طور سے دیا۔ انھوں نے ملت کے افراد کی تعلیم کے لئے جو نظام پیش کیا ہے وہ اس پیام عمل کا حامل ہے ؎

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوز جگر ہے، علم ہے سوزِ دماغ

تعلیم کا اصل مقصد خودی کی نشو و نما ہے ؎

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

ساتھ ہی اس پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ اس خودی کی تعلیم اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نہیں ملتی۔ بلکہ موجودہ تعلیم محض حصول معاش کا ایک ناکافی ذریعہ بن کر رہ گئی ہے ؎

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا — موزوں نہیں مکتب کیلئے ایسے مقالات

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے — قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا — زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوق خراش

اسی طرح انھوں نے سیاست میں بھی مخصوص نظریئے اس پیام اسلامیت و ملیت کے تحت پیش کئے ہیں۔ ملوکیت کے قدیم نظام کو انھوں نے ابلیسی نظام قرار دیا ہے ؎

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام — پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام
یہ ہماری سعی پیہم کی کرامت ہے کہ آج — صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

ساتھ ہی وہ دور حاضر کی جمہوریت کو بھی بہتر اور محمود نہیں سمجھتے ؎

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اور فارسی کلام میں تو اس سے بھی بڑھ کر یہ فرماتے ہیں ؎

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انساں نمی آید

اور آخر عمر کے تجربات و مشاہدات نے عہد حاضر کی جمہوریت کی طرف سے ان کا دل اور کھٹا کر دیا تھا ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

ایک دوسرے مقام پر:

تو نے دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

انھوں نے اشتراکیت کی ایک حد تک تائید کی ہے۔ کیونکہ اس میں ان کو اسلامی حکومت کے بہت سے اجزا ملتے ہیں، نیز اخلاقی حیثیت سے انھوں نے اس غیر متوازن زندگی کی جو سرمایہ داری کا قدرتی نتیجہ ہے۔ سخت مخالفت کی اور مساوات انسانی کی تلقین کی ہے اور اس پر مسرت ظاہر کرتے ہیں کہ اشتراکی تحریک نے سرمایہ داروں کے مکر و فریب کے پردے چاک کر دیئے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی انھوں نے اس تحریک کے بنیادی اصولوں کو مسترد کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ خالص طبعی مادی تحریک ہے جس کی بنیاد توحید خداوندی پر نہیں، بلکہ شکم پرستی پر ہے اس لئے انجام و مآل کے لحاظ سے اشتراکیت و ملوکیت میں کوئی فرق نہیں، دونوں بندۂ زر اور بندۂ شکم ہیں اور دونوں فلاح انسانی کا باعث نہیں بن سکتیں۔

انھوں نے ان سارے نظام ہائے سیاست سے بے اطمینانی ظاہر کرنے کے بعد اسلامی نظریہ حکومت کی تائید کی ہے جس کی بنیاد مذہب و اخلاق کی صحیح تعلیم پر ہو[۵]

جلال بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

انہوں نے اس نظام سلطنت کو قائم کرنے کا پیام دیا ہے جس میں روح و مادہ کی وحدت قائم رہے اور ایسا نظام سلطنت صرف اسلام نے پیش کیا تھا ۔

یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا | بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہو انسانیت کی | کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

زندگی کے سارے مسائل پر اقبال نے اسی اسلامی نقطہ نظر سے نظر ڈالی ہے اور یہی ان کا حقیقی پیام تھا جس کی بدولت ان کو بقاء دوام حاصل ہوئی۔ جسے انہوں نے عالمی و آفاقی رنگ اپنے شاعرانہ کمال کے ذریعہ دیا ہے۔

ہمالہ

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہو گردشِ شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہو، تو دیوارِ ہندستاں ہو تو
مطلعِ اول فلک جس کا ہو وہ دیواں ہو تو
سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہو تو
برف نے باندھی ہو دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہو جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر

تیری عمرِ رفتہ کی اک آن ہے عہدِ کہن
وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن
چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرمِ سخن
تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن
چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیال ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کے لیے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے
تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے
دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے
ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی — جھومتی ہے نشۂ ہستی میں ہر گل کی کلی
یوں زبانِ برگ سے گویا ہے اس کی خامشی — دستِ گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنجِ خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی — کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی — سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اس عراقِ دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلیٰ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا — دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا — وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

اے ہمالہ! داستاں اس وقت کی کوئی سنا — مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا — داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

مرزا غالب

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا — ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا — زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ وار

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر

آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر[۱] میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے! اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سر زمیں
آہ! اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے

اے جہان آباد، اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر

دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

۱؎ جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے اس جگہ مدفون ہے۔

تصویرِ درد

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں؟
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

اٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

اڑا لی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

ٹپک اے شمع! آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری

مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں، خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

دریں حسرت سرا عمریست افسونِ جرس دارم
ز فیضِ دل طپیدن ہا خروشِ بے نفس دارم

ریاضِ دہر میں ناآشنائے بزمِ عشرت ہوں
خوشی روتی ہے جس کو، میں وہ محرومِ مسرت ہوں

ری بگڑی ہوئی تقدیر کو روتی ہے گویائی
میں حرفِ زیرِ لب شرمندۂ گوشِ سماعت ہوں
ریشاں ہوں میں مشتِ خاک، لیکن کچھ نہیں کھلتا
سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں
سب کچھ ہو مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا
سراپا نور ہو جس کی حقیقت، میں وہ ظلمت ہوں
زینہ ہوں، چھپایا مجھ کو مشتِ خاکِ صحرا نے
کسی کو کیا خبر ہے میں کہاں ہوں کس کی دولت ہوں
ظر میری نہیں ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی
میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں
صہبا ہوں، نہ ساقی ہوں، نہ مستی ہوں، نہ پیمانہ
میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں
مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے
طا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں
کہ بامِ عرش کے طائر ہیں میرے ہم زبانوں میں
ثر یہ بھی ہے اک میرے جنونِ فتنہ ساماں کا
مرا آئینۂ دل ہے قضا کے رازدانوں میں
لاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑا باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
سن اے غافل صدا میری! یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک؟ لذتِ فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو، اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
یہی آئینِ قدرت ہے۔ یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن، محبوبِ فطرت ہے

ید آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

لانا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوز پنہاں سے
تری ظلمت میں میں روشن چراغاں کر کے چھوڑوں گا

ہ غنچوں کی صورت ہوں دل درد آشنا پیدا
چمن میں مشت خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا

ونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے، تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

ھے اے ہم نشیں! رہنے دے شغل سینہ کاوی میں
کہ میں داغ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا

کھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورت آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

جو ہے پردوں میں پنہاں، چشم بینا دیکھ لیتی ہے
زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

ار نعت کی لذت سے نہ دل کو آشنا تو نے
گذاری عمر پستی میں مثال نقش پا تو نے

ا دل بستہ محفل مگر اپنی نگاہوں کو
کیا بیرون محفل سے نہ حیرت آشنا تو نے

اگر تا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر
مگر دیکھی نہ اس آئینہ میں اپنی ادا تو نے

تعصّب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے بُرا تو
سراپا نالۂ بیدادِ سوزِ زندگی ہو جا!
سپند آسا گرہ میں باندھ رکھی ہے صدا تو
صفائے دل کو کیا آرائشِ رنگِ تعلق سے
کفِ آئینہ پہ باندھی ہے او ناداں! حنا تو
زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ رُوتا ہے
غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو
زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل!
بنایا ہے بتِ پندار کو اپنا خدا تو
کنوئیں میں تو نے یوسفؑ کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا
ارے غافل! جو مطلق تھا، مقید کر دیا تو
ہوس بالائے منبر ہے تجھے رنگیں بیانی کی
نصیحت بھی تری صورت ہے اک افسانہ خوانی کی
دکھا وہ حسنِ عالم سوز اپنی چشمِ پرنم کو
جو تڑپاتا ہے پروانے کو، رلواتا ہے شبنم کو
نرا نظارہ ہی اے بوالہوس! مقصد نہیں اسکا
بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشمِ آدم کو
اگر دیکھا بھی اس نے سارے عالم کو تو کیا دیکھا
نظر آئی نہ کچھ اپنی حقیقت جام سے جم کو

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو
نہ اٹھا جذبۂ خورشید سے اک برگِ گل تک بھی
یہ رفعت کی تمنا ہے کہ لے اڑتی ہے شبنم کو
پھرا کرتے نہیں مجروحِ الفت فکرِ درماں میں
یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنے مرہم کو
محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے

دوا ہر دکھ کی ہے مجروحِ تیغِ آرزو رہنا
علاجِ زخم ہے آزادِ احسانِ رفو رہنا
شرابِ بےخودی سے تا فلک پرواز ہے میری
شکستِ رنگ سے سیکھا ہے میں نے بن کے بو رہنا
تھمے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشمِ شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا
بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ! کیا رہنا جو ہو بےآبرو رہنا
جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا
یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو
تجھے بھی چاہیے مثلِ حبابِ آب جو رہنا

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو رہنا

شرابِ روح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی
سکھایا اس نے مجکو مست بے جام و سبو رہنا

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

بیابانِ محبت دشتِ غربت بھی، وطن بھی ہے
یہ ویرانہ قفس بھی، آشیانہ بھی، چمن بھی ہے

محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے، صحرا بھی
جرس بھی، کارواں بھی، راہبر بھی، راہزن بھی ہے

مرض کہتے ہیں سب اس کو، یہ ہے لیکن مرض ایسا
چھپا جس میں علاجِ گردشِ چرخِ کہن بھی ہے

جلانا دل کا ہے گویا سراپا نور ہو جانا
یہ پروانہ جو سوزاں ہو تو شمعِ انجمن بھی ہے

وہی اک حسن ہے۔ لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا، بیستوں بھی، کوہکن بھی ہے

اُجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے

سکوت آموز طولِ داستانِ درد ہے ورنہ
زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تابِ سخن بھی ہے

نمی گردید کوتہ رشتۂ معنی رہا کردم
حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن! اگر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوٹے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے
آ، غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامان آسمان سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

محبت

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی ناآشنا خم سے
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذتِ رم سے
قمر اپنے لباسِ نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئینِ مسلم سے
ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے ابھری ہی تھی دنیا
مذاقِ زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے
کمالِ نظمِ ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
ہویدا تھی نگینے کی تمنا چشمِ خاتم سے
سنا ہے عالمِ بالا میں کوئی کیمیاگر تھا
صفا تھی جس کی خاکِ پا میں بڑھ کر ساغرِ جم سے
لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اکسیر کا نسخہ
چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشمِ روحِ آدم سے
نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیاگر کی
وہ اس نسخے کو بڑھ کر جانتا تھا اسمِ اعظم سے
بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب
تمنائے دلی آخر بر آئی سعیِ پیہم سے
پھرایا فکرِ اجزا نے اسے میدانِ امکاں میں
چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہِ حق کے محرم سے
چمک تارے سے مانگی، چاند سے داغِ جگر مانگا
اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی، حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفس ہائے مسیحِ ابنِ مریم سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی
ملک سے عاجزی، افتادگی تقدیرِ شبنم سے
پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے
مہوس نے یہ پانی ہستیِ نوخیز پر چھڑکا
گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کارِ عالم سے
ہوئی جنبش عیاں، ذروں نے لطفِ خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے
خرامِ ناز پایا آفتابوں نے، ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں نے

حقیقتِ حسن

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اسکی
وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے اسکی
کہیں قریب تھا، یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی، اخترِ سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمین کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے

چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا، سوگوار گیا!

گورستانِ شاہی

آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے
کچھ مکدر سا جبینِ ماہ کا آئینہ ہے
چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں
صبحِ صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں
کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی
بربطِ قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی

باطنِ ہر ذرۂ عالم سراپا درد ہے
اور خاموشی لبِ ہستی پہ آہِ سرد ہے

آہ! جولانگاہِ عالمگیر یعنی وہ حصار
دوش پر اپنے اٹھائے سیکڑوں صدیوں کا بار
زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنسان ہے
یہ خموشی اسکے ہنگاموں کا گورستان ہے

اپنے سکانِ کہن کی خاک کا دلدادہ ہے
کوہ کے سر پہ مثالِ پاسباں استادہ ہے

ابر کے روزن سے وہ بالائے بام آسماں
ناظرِ عالم ہے نجمِ سبز فامِ آسماں

خاک بازی وسعتِ دنیا کا ہے منظر اسے
داستاں ناکامیِ انساں کی ہے ازبر اسے

ہے ازل سے یہ مسافر سوئے منزل جا رہا
آسماں سے انقلابوں کا تماشا دیکھتا

گو سکوں ممکن نہیں عالم میں اختر کے لئے
فاتحہ خوانی کو یہ ٹھہرا ہے دم بھر کے لئے

رنگ و آبِ زندگی سے گل بدامن ہے زمیں
سینکڑوں خوں گشتہ تہذیبوں کا مدفن ہے زمیں

خوابگاہ شاہوں کی ہے یہ منزلِ حسرت فزا
دیدۂ عبرت! خراجِ اشکِ گلگوں کر ادا

ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے
آہ! اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اسقدر
جنبشِ مژگاں سے ہے چشمِ تماشا کو حذر

کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں
جو اتر سکتی نہیں آئینۂ تحریر میں

سوتے ہیں خاموش آبادی کے ہنگاموں سے دور
مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناصبور

قبر کی ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک
جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک

کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل
جن کی تدبیرِ جہانبانی سے ڈرتا تھا زوال

رعبِ فغفوری ہو دنیا میں کہ شانِ قیصری
ٹل نہیں سکتی غنیمِ موت کی یورش کبھی

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

شورشِ بزمِ طرب کیا! عود کی تقریر کیا!
دردمندانِ جہاں کا نالۂ شب گیر کیا!

عرصۂ پیکار میں ہنگامۂ شمشیر کیا!
خون کو گرمانے والا نعرۂ تکبیر کیا!

اب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں
سینۂ ویراں میں جانِ رفتہ آ سکتی نہیں

روحِ مشتِ خاک میں زحمت کشِ بیداد ہے
کوچہ گردِ نے ہوا جس دم نفس، فریاد ہے
زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا، کوئی دم، چہچہایا، اڑ گیا
آہ! کیا آئے ریاضِ دہر میں ہم، کیا گئے!
زندگی کی شاخ سے پھوٹے، کھلے، مرجھا گئے

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستمگر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

سلسلہ ہستی کا ہے اک بحرِ ناپیدا کنار
اور اس دریائے بے پایاں کی موجیں ہیں مزار
اے ہوس! خوں رو، کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار
یہ شرارے کا تبسم، یہ خسِ آتش سوار
یہ قمر، جو ناظمِ عالم کا اک اعجاز ہے
پہنے سونے کی قبا محوِ خرامِ ناز ہے
چرخِ بے انجم کی دہشتناک وسعت میں مگر
بےکسی اس کی کوئی دیکھے ذرا وقتِ سحر

اک ذرا سا ابر کا ٹکڑا ہے، جو مہتاب تھا
آخری آنسو ٹپک جانے میں ہو جس کی فنا

زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار
رنگہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار
اس زیاں خانے میں کوئی ملتِ گردوں وقار
رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار
اس قدر قوموں کی بربادی سے ہے خوگر جہاں
دیکھتا بے اعتنائی سے ہے یہ منظر جہاں
اک صورت پہ نہیں رہتا کسی شے کو قرار
ذوقِ وحدت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار

ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نامِ نو
مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوامِ نو

ہے ہزاروں قافلوں سے آشنا یہ رہگزر
چشمِ کوہِ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاجور

مصر و بابل مٹ گئے، باقی نشاں تک بھی نہیں
دفترِ ہستی میں اُنکی داستاں تک بھی نہیں

آدبایا مہرِ ایراں کو اجل کی شام نے
عظمتِ یونان و روما لوٹ لی ایام نے

آہ! مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا
آسماں سے ابرِ آذاری اٹھا، برسا، گیا

ہے رگِ گل صبح کے اشکوں سے موتی کی لڑی
کوئی سورج کی کرن شبنم میں ہے اُلجھی ہوئی

سینۂ دریا شعاعوں کے لئے گہوارہ ہے
کس قدر پیارا لبِ جو مہر کا نظارہ ہے

محوِ زینت ہے صنوبر، جوئبار آئینہ ہے
غنچۂ گل کے لئے بادِ بہار آئینہ ہے

نعرہ زن رہتی ہے کوئل باغ کے کاشانے میں
چشمِ انساں سے نہاں، پتوں کے عزلت خانے میں

اور بلبل، مطربِ رنگیں نوائے گلستاں
جس کے دم سے زندہ ہے گویا ہوائے گلستاں

عشق کے ہنگاموں کی اڑتی ہوئی تصویر ہے
ق
خامۂ قدرت کی کیسی شوخ یہ تحریر ہے!

باغ میں خاموش جلسے گلستاں زادوں کے ہیں
وادیِ کہسار میں نعرے شباں زادوں کے ہیں

زندگی سے یہ پرانا خاکداں معمور ہے
موت میں بھی زندگانی کی تڑپ مستور ہے

پتیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح
دستِ طفلِ خفتہ سے رنگیں کھلونا جس طرح

اس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے
ایک غم یعنی غمِ ملت ہمیشہ تازہ ہے

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

اشکباری کے بہانے ہیں یہ اجڑے بام و در
گریۂ پیہم سے بینا ہے ہماری چشمِ تر

دہر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم
آخری بادل ہیں اک گزرے ہوئے طوفاں کے ہم

ہے ابھی صد با گہر اس ابر کی آغوش میں
برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں

وادیٔ گل خاکِ صحرا کو بنا سکتا ہے یہ
خواب سے امید دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

فلسفۂ غم

(میاں فضل حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لا لاہور کے نام)

گو سراپا کیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی
اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی

موجِ غم پر رقص کرتا ہے حبابِ زندگی
ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ ہو بلبل، وہ بلبل ہی نہیں

آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں
نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں

دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے
روح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کے لئے گردِ ملال

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

طائرِ دل کے لئے غم شہپرِ پرواز ہے
راز ہے انساں کا دل غم انکشافِ راز ہے

غم نہیں، غم، روح کا اک نغمۂ خاموش ہے
جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

شام جس کی آشنائے نالۂ "یارب" نہیں
جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں

جس کا جامِ دل شکستِ غم سے ہے ناآشنا
جو سدا مستِ شرابِ عیش و عشرت ہی رہا

ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوکِ خار سے
عشق جس کا بے خبر ہے ہجر کے آزار سے

کلفتِ غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے
زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

اے کہ نظمِ دہر کا ادراک ہے حاصل تجھے
کیوں نہ آساں ہو غم و اندوہ کی منزل تجھے

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
عقلِ انسانی ہے فانی، زندۂ جاوید عشق

عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے
عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے

رخصتِ محبوب کا مقصد فنا ہوتا اگر
جوشِ الفت بھی دلِ عاشق سے کر جاتا سفر

عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں
روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں

ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی
زندگانی ہے عدم ناآشنا محبوب کی

آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی

آئنہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسارِ حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور

نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے
یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے

جوئے سیمابِ رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی

ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثلِ تارِ سیم ہے

ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی
گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی

پستیِ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو
یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو

دامنِ دل بن گیا ہو رزم گاہِ خیر و شر
راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سوئے منزل سفر

خضرِ ہمت ہو گیا ہو آرزو سے گوشہ گیر
فکر جب عاجز ہو اور خاموش آوازِ ضمیر

وادیِ ہستی میں کوئی ہم سفر تک بھی نہ ہو
جادہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

وطنیت

(یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے)

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی

ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوّت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیّتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

شکوہ

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
فکرِ فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصّۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
سازِ خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم
اے خدا! شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذاتِ قدیم
پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرطِ انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم
بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم؟
ہم کو جمعیّتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ امّت ترے محبوب کی دیوانی تھی؟

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیونکر؟
تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا؟

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی، تورانی بھی اہلِ چیں چین میں، ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی
پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے؟
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے؟

تھے ہمیں اک ترے معرکہ آراؤں میں! خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کے لیے اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لیے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لیے سربکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کے لیے؟
قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی؟

ٹل نہ سکتے تھے، اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے تیغ کیا چیز ہے؟ ہم توپ سے لڑ جاتے تھے؟

نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے؟ شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے؟ کاٹ کر رکھ دیے کفار کے لشکر کس نے
کس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایراں کو؟
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟

کونسی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی؟ اور تیرے لئے زحمت کش پیکار ہوئی
کس کی شمشیر جہانگیر جہاندار ہوئی؟ کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی
کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
منہ کے بل گر کے ھُوَ اللہ اَحَد کہتے تھے

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے!
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے!

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے مئے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے
کوہ میں دشت میں لیکر ترا پیغام پھرے اور معلوم ہے تجھکو کبھی ناکام پھرے
دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہمنے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہمنے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے

ے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے ۔ تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں

ں اور بھی ہیں ان میں گنہگار بھی ہیں ۔ عجز والے بھی ہیں مست مئے پندار بھی ہیں
ں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں ۔ سینکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

نم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے ۔ ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
ل دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے ۔ اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

خندہ زن کفر ہے، احساس تجھے ہے کہ نہیں؟
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

ت نہیں، ہیں ان کے خزانے معمور ۔ نہیں محفل میں جنہیں بات بھی کرنے کا شعور
یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور ۔ اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں؟

مانوں میں ہے دولت دنیا نایاب ۔ تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب
ہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب ۔ رہرو دشت ہو سیلی زدۂ موج سراب

طعن اغیار ہے، رسوائی ہے، ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے؟

ہم اغیار کی اب چاہنے والی دنیا — رہ گئی اپنے لیے ایک خیالی دنیا
ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا — پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے — شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے اپنا صلہ لے بھی گئے — آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

آئے عشاق، گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

دردِ لیلیٰ بھی وہی قیس کا پہلو بھی وہی — نجد کے دشت و جبل میں رمِ آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی حسن کا جادو بھی وہی — امتِ احمدِ مرسل بھی وہی، تو بھی وہی

پھر یہ آزردگیِ غیر سبب کیا معنی ؟
اپنے شیداؤں پہ یہ چشمِ غضب کیا معنی ؟

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربی کو چھوڑا ؟ — بت گری پیشہ کیا؟ بت شکنی کو چھوڑا ؟
عشق کو عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا ؟ — رسمِ سلمانؓ و اویسؓ قرنی کو چھوڑا ؟

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثلِ بلالِ حبشی رکھتے ہیں

عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی — جادہ پیمائیِ تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی — اور پابندیِ آئینِ وفا بھی نہ سہی

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

اک اشارے میں ہزاروں کے لئے دل تو نے
سر فاراں پہ کیا دین کو کامل تو نے
پھونک دی گرمیٔ رخسار سے محفل تو نے
آتش اندوز کیا عشق کا حاصل تو نے
آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں
ہم وہی سوختہ ساماں ہیں تجھے یاد نہیں

قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا
وادیٔ نجد میں وہ شور سلاسل نہ رہا
گھر یہ اجڑا ہے کہ تو رونق محفل نہ رہا
حوصلے وہ نہ رہے ہم نہ رہے دل نہ رہا
اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفل ما باز آئی !

سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کو کو بیٹھے
بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لب جو بیٹھے
تیرے دیوانے بھی ہیں منتظر ہو بیٹھے
دور ہنگامۂ گلزار سے یکسو بیٹھے
اپنے پروانوں کو پھر ذوق خود افروزی دے
برق دیرینہ کو فرمان جگرسوزی دے

لے اڑا بلبل بے پر کو مذاق پرواز
قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز
تو ذرا چھیڑ تو دے، تشنۂ مضراب ہے ساز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز
نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لئے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لئے

مور بے مایہ کو ہمدوش سلیماں کر دے
مشکلیں امت مرحوم کی آساں کر دے

جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے   ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کر دے

جوئے خوں می چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشترکدۂ سینۂ ما

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن   کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا، ٹوٹ گیا سازِ چمن   اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں   پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں
وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں   ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں

قید موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی

لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزا جینے میں   کچھ مزا ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں
کتنے بیتاب ہیں جوہر مرے آئینے میں   کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں

اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہیں وہ لالے ہی نہیں

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں   جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں   پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں

عجمی خم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری

شمع اور شاعر

فروری ۱۹۱۲ء

شاعر

دوش می گفتم بہ شمعِ منزلِ ویرانِ خویش
گیسوے تو از پرِ پروانہ دارد شانہ ای

در جہاں مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ستم
نے نصیبِ محفلے، نے قسمتِ کاشانہ ای

مدتے مانندِ تو من ہم نفس می سوختم
در طوافِ شعلہ ام بالے نہ زد پروانہ ای

می تپد صد جلوہ در جانِ امل فرسودِ من
بر نمی خیزد ازیں محفل دلِ دیوانہ ای

از کجا ایں آتشِ عالم فروز اندوختی
کرمکِ بے مایہ را سوزِ کلیم آموختی

شمع

مجھ کو جو موجِ نفس دیتی ہے پیغامِ اجل
لب اسی موجِ نفس سے ہے نوا پیرا ترا

میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضمر مری فطرت میں سوز
تو فروزاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا

گریہ ساماں میں کہ میرے دل میں ہے طوفانِ اشک
شبنم افشاں تو کہ بزمِ گل میں ہو چرچا ترا

گل بدامن ہے مری شب کے لہو سے میری صبح
ہے ترے امروز سے نا آشنا فردا ترا

یوں تو روشن ہے مگر سوزِ دروں رکھتا نہیں
شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ترا

سوچ تو دل میں لقب ساقی کا ہے زیبا تجھے
انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ بے صہبا ترا

اور ہے تیرا شعار، آئینِ ملت اور ہے
زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا

کعبہ پہلو میں ہے اور سودائی بتخانہ ہے
کس قدر شوریدہ سر ہے شوقِ بے پروا ترا

قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا ترا، محمل ہے بے لیلا ترا

اے دُرِ تابندہ اے پروردۂ آغوشِ موج
لذتِ طوفاں سے ہے نا آشنا دریا ترا

اب نوا پیرا ہے کیا؟ گلشن ہوا برہم ترا
بے محل تیرا ترنم، نغمہ بے موسم ترا

تھا جنھیں ذوقِ تماشا، وہ تو رخصت ہو گئے
لے کے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا ہے کیا

انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اُٹھ گئے
ساقیا! محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا
آہ! جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی
پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا
آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پروانہ تھا
اب کوئی سودائیِ سوزِ ناتمام آیا تو کیا
پھول بے پروا ہیں، تو گرمِ نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے، آوازِ درا ہو یا نہ ہو
شمعِ محفل ہو کے تو جب سوز سے خالی رہا
تیرے پروانے بھی اس لذت سے بیگانے رہے
رشتۂ الفت میں جب ان کو پرو سکتا ہے تو
پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے
شوقِ بے پروا گیا، فکرِ فلک پیما گیا
تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے
وہ جگر سوزی نہیں، وہ شعلہ آشامی نہیں
فائدہ پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے
خیر، تو ساقی سہی لیکن پلائے گا کسے؟
اب نہ وہ میکش رہے باقی نہ میخانے رہے؟

رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اُسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

آج ہیں خاموش وہ دشتِ جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلیٰ رہی، لیلیٰ کے دیوانے رہے

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی
شہر ان کے مٹ گئے، آبادیاں بَن ہو گئیں

سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں

دہر میں عیشِ دوام آئین کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

خود تجلّی کو تمنّا جن کے نظاروں کی تھی
وہ نگاہیں نا امیدِ نورِ ایمن ہو گئیں

اُڑتی پھرتی تھیں ہزاروں بلبلیں گلزار میں
دل میں کیا آئی کہ پابندِ نشیمن ہو گئیں

وسعتِ گردوں میں تھی ان کی تڑپ نظّارہ سوز
بجلیاں آسودۂ دامانِ خرمن ہو گئیں

دیدۂ خونبار ہو منّت کشِ گلزار کیوں؟
اشکِ پیہم سے نگاہیں گل بداماں ہو گئیں

شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبحِ عید کی
ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن اُمید کی

مژدہ اے پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز!
بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش
نقدِ خودداری بہائے بادۂ اغیار تھی
پھر دکاں تیری ہے لبریزِ صدائے ناؤ نوش
ٹوٹنے کو ہے طلسمِ ماہ سیمایانِ ہند
پھر سلیمیٰ کی نظر دیتی ہے پیغامِ خروش
پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شرابِ خانہ ساز
دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش
نغمہ پیرا ہو کہ یہ ہنگام خاموشی نہیں
ہے سحر کا آسماں خورشید سے مینا بدوش
در غمِ دیگر بسوز و دیگراں را ہم بسوز
گفتمت روشن حدیثے گر توانی دار گوش
کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری
ہاں سنا دے محفلِ ملت کو پیغامِ سروش

آنکھ کو بیدار کر دے وعدۂ دیدار سے
زندہ کر دے دل کو سوزِ جوہرِ گفتار سے

رہزنِ ہمت ہوا ذوقِ تن آسانی ترا
بحر تھا صحرا میں تو، گلشن میں مثلِ جو ہوا
اپنی اصلیت پہ قائم تھا، تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروانِ بو ہوا
زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا
پھر کہیں سے اسکو پیدا کر، بڑی دولت ہے یہ
زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا
آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی، دنیا میں رسوا تو ہوا
فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں، اور بیرونِ دریا کچھ نہیں
پردۂ دل میں محبت کو ابھی مستور رکھ
یعنی اپنی مے کو رسوا صورتِ مینا نہ کر
خیمہ زن ہو وادیِ سینا میں مانندِ کلیم
شعلۂ تحقیق کو غارت گرِ کاشانہ کر
شمع کو بھی ہو ذرا معلوم انجامِ ستم
صرفِ تعمیرِ سحر خاکسترِ پروانہ کر
تو اگر خوددار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں
ہے جنوں تیرا نیا، پیدا نیا ویرانہ کر
خاک میں تجھکو مقدر نے ملایا ہے اگر
تو عصائے افتاد سے پیدا مثالِ دانہ کر
ہاں! اسی شاخِ کہن پر پھر بنا لے آشیاں
اہلِ گلشن کو شہیدِ نغمۂ مستانہ کر
اس چمن میں پیروِ بلبل ہو یا تلمیذِ گل
یا سراپا نالہ بن جا، یا نوا پیدا نہ کر

کیوں چمن میں بے صدا مثلِ رمِ شبنم ہے تو؟
لب کشا ہو جا سرودِ بربطِ عالم ہے تو!

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں! ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
آہ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
دیکھ آکر کوچۂ چاکِ گریباں میں کبھی
قیس تو، لیلا بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو
وائے نادانی! کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا؟ کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے، لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی تو
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے
اب تلک شاہد ہے جس پر کوہِ فاراں کا سکوت
اے تغافل پیشہ! تجھ کو یاد وہ پیماں بھی ہے
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے!
دل کی کیفیت ہے پیدا پردۂ تقریر میں
کسوتِ مینا میں مے مستور بھی عریاں بھی ہے

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے
اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

راز اس آتش نوائی کا مرے سینے میں دیکھ
جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی!

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی!

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی!

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی!

پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!

نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی!

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!!

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

جوابِ شکوہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے
خاک سے اٹھتی ہے گردوں پہ گزر رکھتی ہے
عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالۂ بے باک مرا

پیرِ گردوں نے کہا سن کے کہیں ہے کوئی
بولے سیارے سرِ عرشِ بریں ہے کوئی
چاند کہتا تھا نہیں اہلِ زمیں ہے کوئی
کہکشاں کہتی تھی، پوشیدہ یہیں ہے کوئی!
کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھے جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا!

تھی فرشتوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا
عرش والوں پہ بھی کھلتا نہیں یہ راز ہے کیا
تا سرِ عرش بھی انساں کی تگ و تاز ہے کیا
آ گئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا؟
غافل آداب سے سکانِ زمیں کیسے ہیں!
شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں!

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے
تھا جو مسجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے؟

عالمِ کیف ہے، دانائے رموزِ کم ہے
ہاں مگر عجز کے اسرار سے نامحرم ہے
ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو!

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا
اشکِ بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہوا نعرۂ مستانہ ترا
کس قدر شوخ زباں ہے دلِ دیوانہ ترا
شکر شکوے کو کیا حسنِ ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہروِ منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہرِ قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں!

ہاتھ بے زور ہیں، الحاد سے دل خوگر ہیں
امتی باعثِ رسوائیِ پیغمبر ہیں
بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں
بادہ آشام نئے بادہ نیا خم بھی نئے
حرمِ کعبہ نیا، بت بھی نئے تم بھی نئے

وہ بھی دن تھے کہ یہی مایۂ رعنائی تھا!
نازشِ موسمِ گل لالۂ صحرائی تھا
جو مسلمان تھا اللہ کا سودائی تھا
کبھی محبوب تمھارا یہی ہرجائی تھا
کسی یکجائی سے اب عہدِ غلامی کر لو
ملتِ احمدِ مرسل کو مقامی کر لو!

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے — ہم سے کب پیار ہے! ہاں نیند تمہیں پیاری ہے
طبعِ آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے — تمہیں کہہ دو یہی آئینِ وفاداری ہے
قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں، تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو — نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن تم ہو — بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو
ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے؟

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟ — نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟ — میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟
تھے تو آبا وہ تمہارے ہی۔ مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو؟

کیا کہا؟ بہرِ مسلماں ہے فقط وعدۂ حور — شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور
عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور — مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور
تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک — ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک — کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں، اور کہیں ذاتیں ہیں!
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

ون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار؟ مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟
س کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار؟ ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار؟
قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں!

کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب زحمتِ روزہ جو کرتے ہیں گوارا تو غریب
م لیتا ہے اگر کوئی ہمارا، تو غریب پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا تو غریب
امرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملتِ بیضا غربا کے دم سے

عظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی برقِ طبعی نہ رہی، شعلہ مقالی نہ رہی
ہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

ر، ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود؟
ضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود یہ مسلماں ہیں! جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!
یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

م تقریر تھی مسلم کی صداقت بیباک عدل اس کا تھا قوی، لوثِ مراعات سے پاک

تھا شجاعت میں وہ اک ہستیِ فوق الادراک
بجرِ فطرتِ مسلم تھا حیا سے نمناک
خود گدازی نمِ کیفیتِ صہبایش بود
خالی از خویش شدن صورتِ مینایش بود

ہر مسلماں رگِ باطل کے لیے نشتر تھا
اس کے آئینۂ ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسا تھا اسے قوتِ بازو پر تھا
ہے تمہیں موت کا ڈر، اس کو خدا کا ڈر تھا
باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیونکر ہو؟

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے، نے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

تم ہو آپس میں غضبناک، وہ آپس میں رحیم
تم خطاکار و خطابیں، وہ خطاپوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم
تختِ فغفور بھی ان کا تھا، سریرِ کَے بھی
یوں ہی باتیں ہیں کہ تم میں وہ حمیت ہے بھی؟

خودکشی شیوہ تمہارا، وہ غیور و خوددار
تم اخوت سے گریزاں، وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار
تم ترستے ہو کلی کو، وہ گلستاں بکنار
اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت ان کی

مثلِ انجم افقِ قوم پہ روشن بھی ہوئے
بتِ ہندی کی محبت میں برہمن بھی ہوئے
شوقِ پرواز میں مہجورِ نشیمن بھی ہوئے
بے عمل تھے ہی جواں دین سے بدظن بھی ہوئے

ان کو تہذیب نے ہر بند سے آزاد کیا
لا کے کعبہ سے صنم خانے میں آباد کیا

قیس زحمت کشِ تنہائیِ صحرا نہ رہے
شہر کی کھائے ہوا، بادیہ پیما نہ رہے
وہ تو دیوانہ ہے، بستی میں رہے یا نہ رہے
یہ ضروری ہے، حجابِ رخِ لیلا نہ رہے

گلۂ جور نہ ہو شکوۂ بیداد نہ ہو
عشق آزاد ہے کیوں حسن بھی آزاد نہ ہو

عہدِ نو برق ہے، آتش زنِ ہر خرمن ہے
ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے
ملتِ ختمِ رسلؐ شعلہ بہ پیراہن ہے

آج بھی ہو جو ابراہیمؑ کا ایمان پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی
گل بر انداز ہے خونِ شہدا کی لالی

رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

امتیں گلشنِ ہستی میں ثمر چیدہ بھی ہیں
اور محرومِ ثمر بھی ہیں، خزاں دیدہ بھی ہیں
سینکڑوں نخل ہیں کاہیدہ بھی، بالیدہ بھی
سینکڑوں بطنِ چمن میں ابھی پوشیدہ بھی ہیں

نخلِ اسلام نمونہ ہے برومندی کا
پھل ہے یہ سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا
غیر یک بانگِ درا کچھ نہیں ساماں تیرا
نخلِ شمع استی و در شعلہ دود ریشۂ تو
عاقبت سوز بود سایۂ اندیشۂ تو

تو نہ مٹ جائیگا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصرِ نو رات ہے، دھندلا سا ستارا تو ہے

ہے جو ہنگامہ بپا یورشِ بلغاری کا
غافلوں کے لیے پیغام ہے بیداری کا
تو سمجھتا ہے یہ ساماں ہے دل آزاری کا
امتحاں ہے ترے ایثار کا، خودداری کا
کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری
ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری
کوکبِ قسمتِ امکاں ہے خلافت تیری
وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

مثلِ بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا
رخت بر دوش ہوائے چمنستاں ہو جا

ہے تنک مایہ، تو ذرّے سے بیاباں ہو جا نغمۂ موج ہے ہنگامۂ طوفاں ہو جا

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے

دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

ہو نہ یہ پھول، تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو

یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو

خیمۂ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے

نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں ہے بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے

چین کے شہر، مراکش کے بیابان میں ہے اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے

رفعتِ شانِ رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ دیکھے

مردمِ چشمِ زمیں، یعنی وہ کالی دنیا وہ تمھارے شہدا پالنے والی دنیا

گرمیِ مہر کی پروردہ، ہلالی دنیا عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا

تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح

غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری

ماسوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

ارتقاء

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی

سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی!

کشاکشِ زم و گرما، تپ و تراش و خراش
ز خاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی!

مقامِ بست و شکست و فشار و سوز و کشید
میانِ قطرۂ نیسان و آتشِ عنبی!

اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی

"مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند"

میں اور تو

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری، تو قتیلِ شیوۂ آزری!

میں نوائے سوختہ در گلو، تو پریدہ رنگ، رمیدہ بو
میں حکایتِ غمِ آرزو، تو حدیثِ ماتمِ دلبری!

مرا عیش غم، مرا شہد سم، مری بود ہم نفسِ عدم
ترا دل حرم، گروِ عجم، ترا دیں خریدۂ کافری!

دمِ زندگی رمِ زندگی، غمِ زندگی سمِ زندگی
غمِ رم نہ کر، سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری!

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری!

کوئی ایسی طرزِ طواف تو مجھے اے چراغِ حرم بتا
کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشتِ سمندری!

گلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغِ سکندری

خضرِ راہ

شاعر

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر
گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب!
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیرخوار
موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب!
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر!
انجمِ کم ضو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب!

دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضر
جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب
کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرارِ ازل
چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب!
دل میں یہ سن کر بپا ہنگامۂ محشر ہوا
میں شہیدِ جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا
اے تری چشمِ جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار
جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش
"کشتیِ مسکین" و "جانِ پاک" و "دیوارِ یتیم"
علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش
چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد
زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش
زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟
ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک
نوجواں اقوامِ نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش!
گرچہ اسکندر رہا محرومِ آبِ زندگی
فطرتِ اسکندری اب تک ہے گرمِ ناؤ نوش!
بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

آگ ہے اولادِ ابراہیمؑ ہے نمرود ہے!
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

جوابِ خضر

صحرانوردی

کیوں تعجب ہے مری صحرانوردی پر تجھے
یہ تگا پوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل
اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہو جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل!
ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل
وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیل
وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ!
اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل!
تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش
اور آبادی میں تو زنجیریِ کشتِ و نخیل!

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

طلوعِ اسلام

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی
اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
"نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی"
تڑپ صحنِ چمن میں، آشیاں میں، شاخساروں میں
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیمابی
وہ چشمِ پاک بیں کیوں زینتِ برگستواں دیکھے
نظر آتی ہے جس کو مردِ غازی کی جگر تابی!

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہیدِ جستجو کر دے

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
ربود آں ترکِ شیرازی دلِ تبریز و کابل را
صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہانبانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا!

ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے!

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے!
مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے!
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا!
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے!
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا!
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا
یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی!

میانِ شاخساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک
ترے بازو میں ہے پروازِ شاہینِ قہستانی!
گمان آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ
ہوئے احرارِ ملت جادہ پیما کس تجمل سے
تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی!
ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں
کہ المانی سے بھی پائندہ نکلا ہے تورانی!
جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا
غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا؟
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!
ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری،
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں!

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!
حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
چہ باید مرد را طبعِ بلندے مشربِ نابے
دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے جانِ بیتابے!
عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے
ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گہر نکلے!
غبارِ رہگذر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے
ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے
حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے!
زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر پائندہ تر تابندہ تر نکلے!

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پُرفشاں ہو جا

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے!
تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
خروش آموزِ بلبل ہو گرہ غنچے کی وا کر دے
کہ تو اس گلستاں کے واسطے بادِ بہاری ہے
پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولاں گہِ اطلس قبایانِ تتاری ہے!
بیا پیدا خریدار است جانِ ناتوانے را
"پس از مدت گزار افتاد بر ما کاروانے را
بیا ساقی نوائے مرغِ زار از شاخسار آمد
بہار آمد نگار آمد نگار آمد قرار آمد

کشید ابرِ بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فرازِ کوہسار آمد!
سرت گردم توہم قانونِ پیشیں سازدہ ساقی
کہ خیلِ نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد
کنار از زاہداں برگیر و بیباکانہ ساغر کش
پس از مدت ازیں شاخِ کہن بانگِ ہزار آمد
بہ مشتاقاں حدیثِ خواجۂ بدر و حنین آور
تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد!
دگر شاخِ خلیلؑ از خونِ ما نمناک می گردد
ببازارِ محبت نقدِ ما کامل عیار آمد!
سرِ خاکِ شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد!

"بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم"

لا الٰہ الا اللہ

خودی کا سرِ نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ
کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود و زیاں لا الہ الا اللہ

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں، لا الہ الا اللہ

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زمان و مکاں، لا الہ الا اللہ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں، لا الہ الا اللہ

اگرچہ بت ہیں جماعت کے آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں، لا الہ الا اللہ

معراج

دے ولولۂ شوق جسے لذتِ پرواز
کر سکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو تاراج

مشکل نہیں یارانِ چمن! معرکۂ باز
پر سوز اگر ہو نفسِ سینۂ دراج

ناوک ہے مسلماں، ہدف اس کا ہے ثریا
ہے سرِ سراپردۂ جاں نکتۂ معراج

تو معنیِ والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج

علم و عشق

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن!
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن!
بندۂ تخمین و ظن! کرمِ کتابی نہ بن!
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات

علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں

عشق مکان و مکیں! عشق زمان و زمیں
عشق سراپا یقیں، اور یقیں فتح باب

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال، لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے ام الکتاب

تقدیر

(ابلیس و یزداں)

ابلیس

اے خدائے کن فکاں! مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر
آہ! وہ زندانی نزدیک و دور و دیر و زود!
حرفِ استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں، مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

یزداں

کب کھلا تجھ پر یہ راز؟ انکار سے پہلے کہ بعد؟

ابلیس

بعد، اے تیری تجلی سے کمالاتِ وجود

یزداں
(فرشتوں کی طرف دیکھ کر)

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے
کہتا ہے "تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود"
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

(ماخوذ از محی الدین ابن عربی)

مردِ مسلماں

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی — ہے اس کا نشیمن، نہ بخارا، نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کے عیار اسکے ارادے — دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرودِ ازلی اسکے شب و روز — آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن
بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم — لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

سلطان ٹیپو کی وصیت

تو رہ نوردِ شوق ہے، منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز! گرمیِ محفل نہ کر قبول

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو، وہ دل نہ کر قبول

باطل دوئی پسند ہے، حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

شعاعِ اُمید

(۱)

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز، کبھی صبح، کبھی شام

مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریِ ایام

نے ریت کے ذروں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام

پھر میرے تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

(۲)

آفاق کے ہر گوشے سے اٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش

اک شور ہے، مغرب میں اجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش

مشرق نہیں گو لذتِ نظارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش

پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے
اے مہرِ جہاں تاب! نہ کر ہم کو فراموش

(۳)

اک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ، صفتِ جوہرِ سیماب

بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب

اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی
جن کے لئے ہر بحرِ پرآشوب ہے پایاب

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب

بتخانے کے دروازہ پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

فنونِ لطیفہ

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

(۱)

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں
گاہ میری نگاہ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں
تو نے یہ کیا غضب کیا! مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو اک راز تھا سینۂ کائنات میں

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے؟
بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے؟
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے؟

(۲)

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا؟
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب لامکاں تیرا ہے یا میرا؟
اسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر؟
مجھے معلوم کیا؟ وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟
محمدؐ بھی ترا جبریلؑ بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

(۳)

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر

عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

تو ہے محیطِ بے کراں، میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہرِ شاہوار کر

نغمۂ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر
حریمِ کبریاؐ سے آشنا کر

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اُسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر

(۵)

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یا رب پھر وہی مشکل نہ بن جائے
نہ کر دیں مجھ کو مجبورِ نوا فردوس میں حوریں
مرا سوزِ دروں پھر گرمیِ محفل نہ بن جائے
کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے
بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے
کہیں اس عالمِ بے رنگ و بو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ دنبالۂ محفل نہ بن جائے
عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی — مری دنیا فغانِ صبح گاہی
تری دنیا میں میں محکوم و مجبور — مری دنیا میں تیری پادشاہی

(۶)

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دلِ ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا
کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی

نہ اُٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں میں
وہی آب و گِل ایراں وہی تبریز ہے ساقی

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی
بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی

غلامِ طغرل و سنجر نہیں میں | کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں | جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن

(۱۰)

متاعِ بے بہا ہے دردو سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

حجاب اکسیر ہے آوارۂ کوئے محبت کو
مری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی

گذر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی

زیارت گاہ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

میری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

کبھی تنہائیِ کوہ و دمن عشق — کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر — کبھی مولا علیؓ خیبر شکن عشق

(۱۱)

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ
وہ ادب گہِ محبت! وہ نگہ کا تازیانہ!

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ! نہ تراشِ آزرانہ

نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت
یہ جہاں عجب جہاں ہے! نہ قفس نہ آشیانہ

رگِ تاک منتظر ہے تری بارشِ کرم کی
کہ عجم کے مے کدوں میں نہ رہی مئے مغانہ!

مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے!
انھیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

مرے خاک و خوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تابِ جاودانہ

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا، نہ شکایتِ زمانہ

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر — شریکِ زمرۂ لایحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں — مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

(۱۲)

ضمیرِ لالہ مئے لعل سے ہوا لبریز
اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز

بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی
کیا ہے اس نے فقیروں کو وارثِ پرویز

پرانے ہیں یہ ستارے، فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز

کسے خبر ہے کہ ہنگامۂ نشور ہے کیا
تری نگاہ کی گردش ہے میری رستاخیز

نہ چھین لذتِ آہِ سحر گہی مجھ سے
نہ کر نگہ سے تغافل کو التفات آمیز
دلِ غمیں کے موافق نہیں ہے موسمِ گل
صدائے مرغِ چمن ہے بہت نشاط انگیز
حدیثِ بے خبراں ہے "تو با زمانہ بساز"
زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ ستیز

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے　　کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی　　اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

(۱۳)

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی
میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی
میں کہاں ہوں تو کہاں ہے؟ یہ مکاں کہ لامکاں ہے؟
یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی
اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی
وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے، رہ و رسمِ شاہبازی
نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دلکشا صدا ہو، عجمی ہو یا کہ تازی

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی
کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی

خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے
بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے
خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے
خرد بیزار دل سے میں خرد سے

(۱۴)

یارب یہ جہانِ گزراں خوب ہے لیکن!
کیوں خوار ہیں مردانِ صفا کیش و ہنرمند
گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ
دنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند
تو برگ گیاہے ندہی اہلِ خرد را
او کشتِ گل و لالہ بہ بخشد بخرے چند
حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مئے گلگوں
مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند
احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند
فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا
افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند

مدت سے ہے آوارۂ افلاک مرا فکر
کر دے اسے اب چاند کی غاروں میں نظر بند

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں نہ سمرقند

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بیں و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند!

ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند

پرسوز و نظرباز و نکوبین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکرخند

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

اعلیحضرت شہید امیر المومنین نادر شاہ غازی رحمۃ اللہ علیہ کے لطف و کرم سے نومبر ۳۳ء میں مصنف کو حکیم سنائی غزنویؒ کے مزار مقدس کی زیارت نصیب ہوئی۔ یہ چند افکار پریشاں جن میں حکیم ہی کے ایک مشہور قصیدے کی پیروی کی گئی ہے، اس روز سعید کی یادگار میں سپرد قلم کیے گئے۔

"ما از پے سنائی و عطار آمدیم"

(۴)

عالم آب و خاک و باد! سر عیاں ہے تو کہ میں؟
وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں
وہ شب درد و سوز و غم کہتے ہیں زندگی جسے
اس کی سحر ہے تو کہ میں اس کی اذاں ہے تو کہ میں؟
کس کی نمود کے لیے شام و سحر ہیں گرم سیر
شانۂ روزگار پر بار گراں ہے تو کہ میں؟
تو کف خاک و بے بصر، میں کف خاک و خود نگر
کشت وجود کے لیے آب رواں ہے تو کہ میں؟

(۵)

(لندن میں لکھے گئے)

تو ابھی رہگزر میں ہے قید مقام سے گزر
مصر و حجاز سے گزر پارس و شام سے گزر

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گذر، بادہ و جام سے گذر
گرچہ ہے دلکشا بہت حُسنِ فرنگ کی بہار
طائرکِ بلند بال دانہ و دام سے گذر
کوہ شگاف تیری ضرب تجھ سے کشادِ شرق و غرب
تیغِ ہلال کی طرح عیشِ نیام سے گذر
تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گذر ایسے امام سے گذر

(۷)

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اُکسانے لگا مرغِ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اُودے اُودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن
برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن
حسنِ بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لئے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن
اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن۔ اپنا تو بن

من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے! آتا ہے دھن جاتا ہے دھن
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھکو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

(۹)

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دم بدم
آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق!
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم
اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم
دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟
اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ، مُلّا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم

(۱۹)

دلِ بیدار فاروقی، دلِ بیدار کراری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری

مشامِ تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشاں اس کا
ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

اس اندیشے سے ضبطِ آہ میں کرتا رہوں کب تک
کہ مغ زادے نہ لے جائیں تری قسمت کی چنگاری

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی، مرا ایماں ہے زناری

(۲۰)

عقل گو آستاں سے دور نہیں — اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب — آنکھ کا نور دل کا نور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن — یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں ایک بھی صاحبِ سرور نہیں

اک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے اک جنوں ہے کہ باشعور نہیں

ناصبوری ہے زندگی دل کی آہ! وہ دل کہ ناصبور نہیں

بے حضوری ہے تیری موت کا راز زندہ ہو تو، تو بے حضور نہیں

ہر گہر نے صدف کو توڑ دیا تو ہی آمادۂ ظہور نہیں

ارِنی میں بھی کہہ رہا ہوں مگر یہ حدیثِ کلیم و طور نہیں

(۲۴)

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں
گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں
رگوں میں گردشِ خوں ہے اگر تو کیا حاصل
حیات سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں
عروسِ لالہ! مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیمِ سحر کے سوا کچھ اور نہیں
جسے کساد سمجھتے ہیں تاجرانِ فرنگ
وہ شے متاعِ ہنر کے سوا کچھ اور نہیں

بڑا کریم ہے اقبالِ بے نوا لیکن
عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں

(۲۶)

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے
یہ عقل و دل ہیں شرر شعلۂ محبت کے
وہ خار و خس کے لئے ہے یہ نیستاں کے لئے
مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گل کے لئے ہے نہ آشیاں کے لئے
رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بیکراں کے لئے
نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے
نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے
ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے اُسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لئے
مرے گلو میں ہے اک نغمۂ جبرئیل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لئے

(٢٩)

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر
احوالِ محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا
سوز و تب و تاب اول سوز و تب و تاب آخر
میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر
میخانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر
خلوت کی گھڑی گزری جلوت کی گھڑی آئی
چھٹنے کو ہے بجلی سے آغوشِ سحاب آخر
تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر

(٣٣)

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

مقامِ گفتگو کیا ہے اگر میں کیمیا گر ہوں
یہی سوزِ نفس ہے اور میری کیمیا کیا ہے
نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں
نہ پوچھ اے ہمنشیں مجھ سے وہ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
اگر ہوتا وہ مجذوب[۱] فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے
نوائے صبح گاہی نے جگر خوں کر دیا میرا
خدایا جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے

(۳۴)

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی
عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحرگاہی
نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی
اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی!

---

[۱] جرمنی کا مشہور مجذوب فلسفی نطشہ جو اپنے قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کر سکا۔ اور اسلئے اسکے فلسفیانہ افکار نے اُسے غلط راستہ پر ڈال دیا۔

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

(۴۰)

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

مسجدِ قرطبہ

(ہسپانیہ کی سرزمین بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی)

سلسلۂ روز شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز شب اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز شب تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب صیرفیِ کائنات
تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات
اوّل و آخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا
ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات! عشق سے نارِ حیات
اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود
تیری فضا دل فروز میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور مجھ سے دلوں کی کشود
عرشِ معلیٰ سے کم سینۂ آدم نہیں
گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہرِ کبود

پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا
اس کو میسر نہیں سوز و گدازِ سجود
کافرِ ہندی ہوں میں، دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود، لب پہ صلوٰۃ و درود
شوق مری لے میں ہے، شوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ھو میرے رگ و پے میں ہے

تیرا جلال و جمال، مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائدار، تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل
تیرے در و بام پر وادیِ ایمن کا نور
تیرا منارِ بلند، جلوہ گہِ جبرئیل
مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیم و خلیل
اس کی زمیں بے حدود، اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج دجلہ و دنیوب و نیل
اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے غریب
عہدِ کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل
ساقیِ اربابِ ذوق، فارسِ میدانِ شوق
بادہ ہے اس کا رحیق، تیغ ہے اس کی اصیل

مردِ سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لا الٰہ

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند اس کا خیالِ عظیم
اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی اُمیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

کعبۂ اربابِ فن! سطوتِ دینِ مبیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں

ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں

آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار
حاملِ "خلقِ عظیم" صاحبِ صدق و یقیں

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں

جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب
ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں

جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہے اندلسی
خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں!
آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں!

کون سی وادی میں ہے۔ کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں

دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں
حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتیٔ نازک رواں
چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں
روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں
دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا
وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پُرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت
کشتیٔ دل کے لئے سیل ہے عہدِ شباب
آبِ روانِ کبیر[لہ]! تیرے کنارے کبھی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

لہ وادی الکبیر قرطبہ کا مشہور دریا جس کے قریب ہی مسجد قرطبہ واقع ہے

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

لینن

(خدا کے حضور میں)

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات
محرم نہیں فطرت کے سرودِ ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات

آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات

ہم بندِ شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات

اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات

جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات

ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

وہ قوم کے فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات

میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات

چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دُنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات؟

فرشتوں کا گیت

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی
خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی
دانش و دین و علم و فن بندگیٔ ہوس تمام
عشقِ گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی
جوہرِ زندگی ہے عشق، جوہرِ عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغِ تیز پردگیٔ نیام ابھی

فرمانِ خدا

(فرشتوں سے)

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غریبوں کا لہو سوزِ یقین سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے، صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

ذوق و شوق

(ان اشعار میں سے اکثر فلسطین میں لکھے گئے)

دریغ آمدم زاں ہمہ بوستاں　　تہی دست رفتن سوئے دوستاں

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسنِ ازل کی ہے نمود، چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لئے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں
سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب
کوہِ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں

گرد سے پاک ہے ہوا، برگِ نخیل دھل گئے
ریگِ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں
آگ بجھی ہوئی اِدھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گذرے ہیں کتنے کارواں
آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کے لئے عیش و دوام ہے یہی

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات تازہ ہیں میرے واردات
کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات
ذکرِ عرب کے سوز میں فکرِ عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات، نے عربی تخیلات
قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات
عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات
صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیریاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
جلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

بادِ صبا کی موج سے نشو و نمائے خار و خس
میرے نفس کی موج سے نشو و نمائے آرزو

خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب

تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
طبعِ زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم تخیلِ بے رطب

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ! عقل تمام بولہب

گاہ بحیلہ می برد، گاہ بزور می کشد
عشق کی ابتدا عجب! عشق کی انتہا عجب

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو! ہجر میں لذتِ طلب

عینِ وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب

گرمیِ آرزو فراق! شورشِ ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق! قطرہ کی آبرو فراق

ایک نوجوان کے نام

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

ساقی نامہ

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
ارم بن گیا دامنِ کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں
فضا نیلی نیلی، ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی
اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ
ذرا دیکھ اے ساقیِ لالہ فام
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام
پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز
کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز

وہ مے جس سے روشن ضمیرِ حیات
وہ مے جس سے ہے مستیِ کائنات

وہ مے جس میں ہے سوز و سازِ ازل
وہ مے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

دلِ طورِ سینا و فاراں دو نیم
تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش

تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب

بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا، حمیت میں فرد

عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا

مجھے عشق کے پر لگا کر اُڑا
مری خاک جگنو بنا کر اُڑا

خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کو استاد کر

ہری شاخِ ملت ترے نم سے ہے
نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے

تڑپنے، پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے

جگر سے وہی تیر پھر پار کر
تمنا کو سینوں میں بیدار کر

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

مری ناؤ گرداب سے پار کر
یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر

بتا مجھکو اسرارِ مرگ و حیات
کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات

مری دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز

اُمنگیں مری آرزوئیں مری
اُمیدیں مری جستجوئیں مری

مری فطرت آئینۂ روزگار
غزالانِ افکار کا مرغزار

مرا دل مری رزم گاہِ حیات
گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے! ٹھکانے لگا دے اسے

دما دم رواں ہے یمِ زندگی
ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی

اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود
کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود

گراں گرچہ ہے صحبتِ آب و گل
خوش آئی اسے محنتِ آب و گل

یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی
عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر

یہ عالم یہ بت خانۂ شش جہات
اسی نے تراشا تھا یہ سومنات

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں، اور میں تو نہیں

من و تو سے ہے انجمن آفریں
مگر عینِ محفل میں خلوت نشیں

چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے
یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے

اسی کے بیاباں اسی کے ببول
اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول

کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور
کہیں اس کے پھندے میں جبریل و حور

کہیں جرہ شاہینِ سیماب رنگ
لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ

کبوتر کہیں آشیانے سے دور
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند
سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

سفر زندگی کے لئے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز

الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے

ہوا جب اُسے سامنا موت کا
کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا

اتر کر جہانِ مکافات میں
رہی زندگی موت کی گھات میں

مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج
اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
اُبھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

بڑی تیز جولاں بڑی زود رس
ازل سے ابد تک رمِ یک نفس

زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے
دموں کے اُلٹ پھیر کا نام ہے

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

اندھیرے اُجالے میں ہے تابناک
من و تو میں پیدا من و تو سے پاک

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی
دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں

سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے

کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں
یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

اُسے واسطہ کیا کم و بیش سے
نشیب و فراز و پس و پیش سے

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر　　ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب　　وہ ناں جس سے جاتی رہے اسکی آب
وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند　　رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
فرو فالِ محمود سے درگزر　　خودی کو نگہ رکھ ایازی نہ کر
وہی سجدہ ہے لائق اہتمام　　کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام
یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت　　یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم، یہ بتخانۂ چشم و گوش　　جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی ہے یہ منزلِ اولیں　　مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں　　جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر　　طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
خودی شیرِ مولا جہاں اس کا صید　　زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود　　کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا　　تری شوخیٔ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار　　کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار
تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت　　تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت
حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ　　حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ
فروزاں ہے سینہ میں شمعِ نفس　　مگر تابِ گفتار رکھتی ہے بس

اگر یک سر موی برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم

فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بیتابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی
جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے
ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی
گراں بہا ہے ترا گریۂ سحرگاہی
اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے

ل آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ — مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ — ایام جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ
بیتاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہ رسا دیکھ

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے
تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے
تو پیرِ صنم خانۂ اسرار ازل سے
محنت کش و خونریز و کم آزار ازل سے
ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ

جبریل و ابلیس

جبریل

ہمدمِ دیرینہ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بو

ابلیس

سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو

جبریل

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاکِ دامن ہو رفو؟

ابلیس

آہ! اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر تیرا سبو
اب یہاں میری گذر ممکن نہیں، ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ و کو
جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اس کے حق میں تَقْنَطُوْا اچھا ہے یا لَا تَقْنَطُوْا

جبریل

کھو دیے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

ابلیس

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے، میں کہ تو
خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا

مرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو! اللہ ہو!! اللہ ہو!!!

قطعہ

کل اپنے مریدوں سے کہا پیرِ مغاں نے
قیمت میں یہ معنی ہے دُرِ ناب سے دہ چند
زہراب ہے اس قوم کے حق میں مئے افرنگ
جس قوم کے بچے نہیں خوددار و ہنرمند

محبت

شہیدِ محبت نہ کافر نہ غازی
محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی
وہ کچھ اور شے ہے محبت نہیں ہے
سکھاتی ہے جو غزنوی کو ایازی
یہ جوہر اگر کارفرما نہیں ہے
تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی
نہ محتاجِ سلطاں نہ مرعوبِ سلطاں
محبت ہے آزادی و بے نیازی
مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی

مسعود مرحوم

یہ مہر و مہ یہ ستارے یہ آسمانِ کبود

کسے خبر کہ یہ عالم عدم ہے یا کہ وجود

خیال جادہ و منزل فسانہ و افسوں
کہ زندگی ہے سراپا رحیلِ بے مقصود

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی
وہ یادگارِ کمالاتِ احمد و محمود

زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اس کی
وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود!

مجھے رلاتی ہے اہلِ جہاں کی بیدردی
فغانِ مرغِ سحر خواں کو جانتے ہیں سرود

نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غمِ دوست
نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود

دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

نہ مجھ سے پوچھ کہ عمرِ گریز پا کیا ہے
کسے خبر کہ یہ نیرنگ و سیمیا کیا ہے

ہوا جو خاک سے پیدا وہ خاک میں مستور
مگر یہ غیبتِ صغریٰ ہے یا فنا؟ کیا ہے؟

غبارِ راہ کو بخشا گیا ہے ذوقِ جمال
خرد بتا نہیں سکتی کہ مدعا کیا ہے

دل و نظر بھی اسی آب و گِل کے ہیں اعجاز
نہیں، تو حضرتِ انساں کی انتہا کیا ہے
جہاں کی روحِ رواں لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو
مسیح و میخ و چلیپا یہ ماجرا کیا ہے
قصاصِ خونِ تمنا کا مانگیے کس سے
گنہگار ہے کون؟ اور خوں بہا کیا ہے
غمیں مشو کہ بہ بند جہاں گرفتاریم
طلسمہائے شکند آں دلے کہ ما داریم
خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات
خودی ہے زندہ تو دریا ہے بے کرانہ ترا
ترے فراق میں مضطر ہے موجِ نیل و فرات
خودی ہے مردہ تو مانندِ کاہ پیشِ نسیم
خودی ہے زندہ تو سلطانِ جملہ موجودات
نگاہ ایک تجلی سے ہے اگر محروم
دو صد ہزار تجلی تلافیٔ مافات
مقامِ بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر
زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات
حریمِ ذات ہے اس کا نشیمنِ ابدی

نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات

خود آگہاں کہ ازیں خاکداں بروں جستند
طلسمِ مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

آوازِ غیب

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے
کھو گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک
کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق؟
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک
تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار
کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ خس و خاشاک؟
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟
کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟
اب تک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں
نے گرمیِ افکار، نہ اندیشۂ بے باک
روشن تو وہ ہوتی ہے، جہاں بیں نہیں ہوتی
جس آنکھ کے پردوں میں نہیں ہے نگہِ پاک

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

شائع کردہ

ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ

قیمت

مطبوعہ

سرفراز قومی پریس لکھنؤ